جہاں کوئی نہ ہو
(نظمیں)
تبسم اعظمی

جہاں کوئی نہ ہو

(نظمیں)

JAHAN KOI NA HO

تبسم اعظمی

جہاں کوئی نہ ہو

نام کتاب	:	جہاں کوئی نہ ہو (نظمیں)
نام شاعرہ	:	طاہرہ تبسم
تخلص	:	تبسم اعظمی
آبائی وطن	:	راجہ پور سکرور، اعظم گڑھ
سنہ اشاعت	:	مارچ 2019
Mob	:	+919984784445
Email	:	tabassumazmi68@gmail.com

ISBN:978-81-939597-2-5

کتاب ملنے کا پتہ

Address

Tabassum Azmi

C/O Dr. Mohd Asif

Saraimir Nursing Home

PO- Saraimir, District-Azamgarh

Pin code-276305 (UP) India

Published by

Sandpiper Publishers

Royal Shopping Centre, Near Naaz Cinema, Aminabad, Lucknow-226018

+91 9044343434

مجھے معلوم ہوا ہے کہ تبسم آکا دوسرا مجموعہ کلام طباعت کے لیے تیار ہے، قلبی سکون ملا۔
کہتے ہیں کہ منزل کو پانے کا جنون ہو تو منزل خود بخود آپ کے پاس آجاتی ہے،
تبسم کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا نا مساعد حالات کے باوجود
انھوں نے اپنی منزل خود تلاش کی۔
دعا ہے کہ آگے بھی ایسے ہی منزل کی طرف گامزن رہیں۔

دعا گو - ڈاکٹر محمد آصف

انتساب

اُن دعاؤں اور محبتوں کے نام

جو میرے لیے حوصلہ بھی ہیں اور مہمیز بھی

تبسّم آعظمی

ترتیب

مضامین

نظمیں

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

واشنگٹن، ڈی سی (یو-ایس- اے)

معصوم شاعری

سادگی، کھرا پن اور بے ریائی عام طور پر شاعری کے گن تسلیم نہیں کیے جاتے۔ یہی سمجھا جاتا ہے کہ نکتہ دانی، زبان و بیان میں دقیقہ رسی شاعری کو آرٹ اور سلیقہ دونوں کا جوہر بخشتی ہیں۔ میں تبسمؔ اعظمی سے متعارف نہیں ہوں لیکن ان کی نظمیں ملنے پر جب انہیں پڑھا تو یہ محسوس ہوا کہ موضوعات کے انتخاب میں زیرکی کے علاوہ نظموں کی ساخت و بافت نازک و نفیس پشمی تاگوں سی کی گئی ہے۔ پتھر کی سی سختی تو در کنار، کہیں بھی سفوفیت، بالیدگی یا رگڑ نہیں ہے۔ نہ صرف دو ہوں کا سا سادہ لباس پہنے ہوئے یہ نظمیں فقیروں کی طرح اپنا راگ الاپتی پھرتی ہیں۔ بلکہ گلیوں محلوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے جو پیغام نشر کرتی ہیں، وہ بھی سادہ اور بے لاگ ہے۔ کہیں کھوٹ نہیں ہے۔

پانی ہے منزل اگر، بیٹھ نہ یوں چپ چاپ:

پانی کے جیسے بنا اپنا رستہ آپ---

یا غالبؔ کے 'مردم گزیدہ' سے مستعار یہ مضمون۔

سانپ ڈسے، اس کی دوا، ہو جاتی ہے آج
مانس جس کو کاٹ لے، اس کا نہیں علاج

تقریباً سبھی نظموں میں دوہوں کی سی یہ سادگی اور نفاست کا امتزاج موجود ہے۔

نئے شعرا میں بہت کم دوستوں کو قارئین تک تصویروں کے میڈیم سے اپنا پیغام پہنچانے کا ہنر آتا ہے۔ وہ الفاظ کی بھرمار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تبسم اعظمی کی لگ بھگ سب نظموں میں الفاظ کے حجاب کے پیچھے کسی نہ کسی تصویر کا چہرہ ہے۔ نظم بعنوان محبت کے زیر عنوان دو درجن کے قریب ایسے الفاظ ہیں جو تصویر سازی کے اس عمل میں کسی چیز کا حقیقی اور علامتی چہرہ ابھارتے ہیں۔ کندن کی دمک چڑیوں کی چہک،، آنسو کا نمک۔۔ کچھ مثالیں ہیں۔

آخری بات جو مجھے پہلے لکھنی چاہیے تھی، وہ تبسّم اعظمی کا-نسائی شاعری کے جلوس میں شرکت سے انکار ہے۔ ان کے بارے میں، فی وقت پاکستان میں شاعرات کی نظموں میں، نسائی مضامین کی بھرمار کو دیکھ کر، یہی کہنا پڑتا ہے کہ ان کے پاس اس جدّت سے، جو بعد میں کثرت استعمال سے بدعت بن گئی، دور رہنے کا شعور ہے، تبھی ہمیں ان کے مجموعہ میں وہ نعرہ زن نسائی شاعری نہیں ملتی جس میں مردوں کے علاوہ، سماج، مذہب اور حکومت کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے شاعرات نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

عزیز الدین خضری

شوگر لینڈ، ٹیکساس، یو-ایس-اے

تبسم اور آنسو

خطہ اعظم گڑھ میں شبلی نعمانی کے علم و ادب کے لگائے ہوئے بیج نے ایک تناور درخت بن کر اپنے سائے تلے تشنگانِ علم و ادب کو خوب خوب سیراب کیا ہے، وہاں اگر نہیں پنپا تو ایک پودا تھا یاسمین کا، وقت گزرتا گیا آبیاری ہوتی رہی کہ اچانک سرزمینِ راجہ پور سکرور سے ایک کونپل نے سر نکالا اور دیکھتے دیکھتے شبلی کے چمن زار میں تبسمؔ بکھر گیا۔

ابھی ایک سال ہی گزرا ہے

"اشکباری میں جو پھوٹی ہے تبسم کی کرن
تب کہیں جا کے رنگین دھنک ابھری ہے"

اور اب

"دھنک" غزلوں کے مجموعہ کے بعد اعظم گڑھ کی پہلی شاعرہ تبسمؔ اعظمی کی فکر کا شہکار "جہاں کوئی نہ ہو" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میرا کہنا کچھ سہی، اب یہ کام آپ ہی کا ہے کہ شعر و ادب میں اس کے مقام کا تعین کیجئے۔

ہر فرد اپنے اور اپنے گرد و پیش کے حالات کا اسیر ہوتا ہے۔ تبسّم کے گرد و پیش جو حالات ہیں، معاشرتی ناہمواریاں جو ہیں یا عالمی سطح پر جو، جور و ستم و تعدّی ہے، اُس سے مفر کہاں۔ اقدار کا جنازہ نکل چُکا ہے۔ ہر طرف ہاہا کار ہے، تبسم مفقود، آنسوؤں کی بھرمار ہے۔ تبسُّم ایک حسّاس دل شاعرہ ہیں اور شاعر تو ہوتے ہی ہیں غمِ دوراں کو غمِ جاں بنا لینے والے۔ یہی سبب ہے کہ تبسُم کی بیشتر نظمُوں میں تبسم کم اور آنسو زیادہ ہیں، تبسّم کے کلام میں جو گہرائی اور درد ہے سیدھے قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں۔

شاعری کا اور شعر کہنے والے کا کمال یہی تو ہے کہ جو کہے، جو پیش کرے، پڑھنے والا بُول اُٹھے، ''یہی تو میرے دل میں بھی تھا۔'' ویسے طاہرہ تبسّم اعظمی، عزم و ارادہ کی پختہ، ایک حوصلہ مند خاتون ہیں، جو حالات کے آگے سپر نہیں ڈالتیں بلکہ اس سے نبرد آزما رہتی ہیں، یاس و ہراس کو پاس پھٹکنے نہیں دیتیں، اپنی فکر و تخیّل کے بُوتے پر معاشرے کو اس کا مکروہ چہرہ دکھانے میں کوشاں اور کامیاب ہیں۔

سارے جنگل میں ماتم ہے پسرا ہوا
ہر درندے کی آنکھیں ہیں اشکوں سے تر
میں نے پوچھا، ''ہوا کیا ہے؟ کچھ تو کہو!
غم ہے کس بات کا، یہ اداسی ہے کیوں؟
بولے، ''روئیں نہیں ہم، تو پھر کیا کریں !
آدمی نے ہماری صفت چھین لی''

انسان سے انسانیت چھن گئی ہے، مختلف حوالوں سے......علاقے، دین دھرم کے بھید بھاؤ کے چلتے عصبیتوں کا دور دورہ ہے۔ تبسّم نے اِس نظم میں اپنے دکھ، درد کو آنسوؤں کے موتیوں کی لڑی میں پرُو کر پیش کیا ہے۔ گویا، بقول امیر مینائی:

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیرؔ

سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

یا فضل احمد کریم فضلی کی گرہ کے مطابق

اہلِ ہنر کے دل میں دھڑکتے ہیں، سب کے دل

سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

شاعری کو روح کی غذا کہا گیا ہے۔ وہ شاعری جو ہماری معاشرتی نشو نُما میں معاون نہ ہو اور بے راہ روی کی ترغیب دے، وہ اگر ہلاکت خیز نہیں تو راستی سے انحراف پر مُنتج ضرور ہوتی ہے اور اُس کے مضر اثرات تہذیب اور شائستگی کے مُسلمہ اُصولوں کے خلاف آپڑتے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں مسلمہ اقدار کا انحطاط ایک ایسی ڈھلوان ہے کہ شروع ہو گئی تو نیچے ہی نیچے جاتی ہے، راہ میں روکاوٹ کوئی کہیں نہیں، انجام غارِ مذلت۔

شاعر بہت سے گزرے ہیں، سب نے قومی تشخص کو بنانے، اُبھارنے، بڑھانے میں بہت کچھ کیا ہے، کچھ نے برعکس بھی۔ اقبال ایک شاعر تھے، آج بھی ہر زبان پر اُن کا نام اقدار کی پاسداری کے سبب زندہ ہے۔ اپنے کلام کے ذریعہ عوام الناس میں اور خاص طور پر نوجوانوں میں ایک نئی روح اُنھوں نے پھونکی۔ مجھے تبسّم اعظمی کی شاعری میں بھی

ایک ایسی ہی شاعرہ نظر آتی ہیں کہ جہاں سے بات "ڈھلوان" کو جاتی ہے، بڑی حکمت اور چابک دستی سے پہلو بچالے جاتی ہیں، ایک بند باندھ دیتی ہیں۔ فنِ شعر گوئی کے ماہرین کو تبسم کی اِس فکری بُلوغت کی داد ضرور دینا چاہئے۔

تبسُّم اعظمی کی تمام تر تخلیقات پر نگاہ رکھنے والے بخُوبی جانتے ہیں کہ یہ شاعری محض حظ اُٹھانے، شہرت حاصل کرنے کے لئے نہیں کرتیں، اپنی صلاحیتوں کو مقصدیت کے تحت، اصلاحِ احوال کی خاطر، بروئے کار لاتی ہیں لیکن ان کا لہجہ کہیں بھی ناصحانہ اور واعظانہ نہیں ہوتا بلکہ دوستانہ رہتا ہے، فصاحت و بلاغت اِن کے کلام کو قبُولِ عام بخشتی ہے۔

میرا مقصد تحریر کو طول دینا نہیں، مگر کیا کیا جائے، تبسُّم کی جولانیٔ طبع اردو ادب کے بھُولے بسرے وہ اصنافِ سُخن لے آتی ہے جو اظہارِ خیال کی باگیں ڈھیلی چھوڑ کر کچھ کہنے پر مجبُور کردیتی ہے۔ یہ لُوک گیت اور ماہئے بھی دیکھئے:

یادیں

وہ چنچل سے دن اور بے فکر رینا
وہ معصوم آنکھوں کا معصوم سپنا
وہ سکھیاں، وہ گڑیا، وہ چوبارہ اپنا
وہ مٹی کا ننھا گھروندا میں ڈھونڈوں
سجن توری نگری میں کیا کیا میں ڈھونڈوں

ماہیئے

امید کی شمعیں ہیں

دیوار پہ کاگا

دہلیز پہ آنکھیں ہیں

ہر سمت اندھیرے ہیں

بھور کے پیغمبر

سورج کے لٹیرے ہیں

یہ جبر کا بندھن ہے

کیسے کلی مسکائے

پت جھڑ کی دلہن ہے''

اس گیت میں ایک نو بیاہتا کے احساسات وجذبات کو کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ تبسّم بنیادی طور پر غزل ہی کی شاعرہ ہیں مگر کون سی صنفِ سُخن اِنھوں نے چھوڑی ہے، تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔

جب پہلی بار اِس لوگ گیت اور ماہیوں کو دیکھا تو بہت کچھ لکھا تھا مگر یہ مضمون اعادہ کا مُتحمّل نہ ہوگا۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ تبسّم کیسے کیسے گل ہائے ماضی، جو مُرجھا

چکے تھے، از سرِ نو تر و تازہ، سرسبز و شاداب کر کے پیش کر دیتی ہیں۔ تبسمؔ صاحبہ اعظمی کی ہر نظم پر تبصرہ تو یہاں ممکن نہیں۔ میں ان کی دو نظموں پر بطور خاص بات کرنا چاہوں گا جن میں قرآنی آیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

مُنتقل

کیا ہے دنیا بھلا؟

اک سرائے ہے بس!

جس میں انسان کچھ دن کا مہمان ہے

اسکے گلشن سے سکھ دکھ کی کلیاں لیے

اپنے اعمال کا بوجھ ڈھوتے ہوئے

سعی پیہم،

مسلسل تھکن سے پرے

اُوڑھ کر خامشی کی رِدا،

ایک دن

دارِ فانی سے ہو جائے گا مُنتقل

شبلی کے شہر کی شاعرہ کے حوصلہ کی داد دیئے بغیر رہا نہیں جا سکتا!

اِس اجمال کی تفصیل یقیناً قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی، ذرا ملاحظہ فرمایئے:

شاعرہ سُوال کرتی ہیں: ''کیا ہے دنیا؟'' ساتھ میں ''بھلا'' بھی لگا دیتی ہیں، جو

''کمی''، بے وقعتی کی طرف اشارا ہے، یعنی دنیا کی کوئی حیثیت نہیں، بس ایک سرائے ہے، وقتی پڑاؤ اور بس۔ یہی تو قرآن بھی کہتا ہے۔ دنیا ویسے تو حسین نظر آتی ہے، مگر ہے مَتاعُ الغُرور = دھوکے کی ٹٹی۔ یہاں دکھ سکھ سب سانجھے، کارگاہِ عمل ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، جو بُو گے وہ کاٹو گے۔ وَاَن لَّیسَ لِلاِنسانِ اِلَّا مَاسَعیٰ (نہیں ہے انسان کے لئے کچھ بھی سوائے اُس کے جس کے لئے وہ کوشش کرے)، مگر انسان ہے کہ (اَلھٰکُمُ التَّکاثُر o حَتّٰی زُرتُمُ المَقَابِرَ o) کہتا رہے گا اور یہاں تک کہ دیکھ لے گا مُنہ قبر کا)، شاعرہ کہتی ہیں:

سعیِ پیہم، مُسلسل تھکن سے پرے
خامشی کی رِدا اُوڑھ کر ایک دن
دارِ فانی سے ہو جائے گا منتقل

وَاِذا بَلَغَتِ الحُلقُوم ...... جب آ اٹکتی ہے گلے میں، وَاَنَّہُ فِراق ...... تو بس چل چلاؤ ہے اب، انتقال یہی تو ہے، مُنتَقِل ہونا اسی کو تو کہتے ہیں!

''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ'' (نظیر اکبر آبادی)

اور اب

''سورۃ المرسلات کا پیغام''، جو اس کتاب کی زینت ہے، ایک بڑا کارنامہ ہے۔ قُرآنِ پاک خالقِ کائنات، رَبُّ السمٰوات والارض کا عظیم معجزہ ہے، نہ اِس کے کوئی مثل ہے اور نہ ہی اس کی کوئی مثال ہے۔ نہ یہ نظم ہے نہ محض نثر۔ اس کی فصاحت و بلاغت سا کلام آج

تک علمِ انسانی میں آیا ہی نہیں۔ عرب فصیح اللسان تھے۔ اس کلام کی فصاحت و بلاغت پہ ششدر و حیران تھے۔

مروجہ اُصول کے تحت سورۂ کوثر جب خانۂ کعبہ میں آویزاں کی گئی تو مہینوں ٹنگی رہی ، شعراء آتے ، دیکھتے ، بے بسی ، معذوری کی تصویر بنے جاتے رہے۔ ایک مدت بعد ایک شاعر نے جرأت کی تو اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے ، لکھ گیا " **مَاھٰذا کلامُ البشر** " (یہ انسانی کلام ہو ہی نہیں سکتا)۔ اُس کی لگائی ہوئی گرہ پھر بھی قُرآنی آیت کے ہم پلّہ اور ہم وزن نہیں ہوئی کہ کلام اللہ کی نقّالی بشر کے بس کی بات نہیں۔

قُرآنِ پاک کے منظوم تراجم ہوئے ہیں اور بعض سورتوں کے الگ الگ بھی۔ جوش صاحب کی سورۂ رحمٰن کی منظوم ترجمانی بھی خوب ہے۔

تبسُّم اعظمی کا ہر صنفِ سُخن میں جولانیٔ قلم کا بطریقِ احسن ثبُوت اپنی غزلوں کی مطبوعہ " دھنک " میں دینے کے بعد نظم میں سورۂ مُرسلات پر قلم اُٹھانا اور ترجمانی کرنا بڑی جرأت اور حوصلہ کا کام ہے۔ جس خوش اسلوبی اور مہارت سے ترجمانی کی ہے ، اصحابِ علم تعریف و تحسین کی نگاہ سے تو دیکھیں گے ہی ، منجانب اللہ کریم بھی بڑے فیوض ، برکات اور عظیم اجر سے نوازا جانا بھی بعید از قیاس نہیں۔ قرآن ایک مربوط صحیفہ ہے۔ اِس کی ایک سورہ دوسری سورہ سے الگ ہوتے ہوئے بھی ہدایات اور پیغام کے لحاظ سے بنی نوعِ انسان کے لئے ایک مسلسل ہدایت نامہ ہے۔ اِس سورہ کی ترجمانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تبسم کی نگاہ پُورے قرآن پر ہے۔

آج تک دنیا کی کوئی کتاب سوائے قرآنِ پاک کے ایسی نہیں جس کے ترجمے لاکھوں افراد سیکڑوں زبانوں میں نہ کر چکے ہوں مگر پھر بھی، سچ پوچھئے تو، کوئی دعوائے نہیں کر سکتا کہ حق کُلّی طور پر ادا کر دیا۔ مخلوق سے خالق کے کلام کی ترجمانی کہاں ممکن۔ بااِیں ہمہ شاعرہ کی ہمت کی داد دی جانا چاہئے۔ ترنم وروانی کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے سورہ کے مضمون کو سمُویا ہے وہ بلاشبہ قابلِ داد وستائش ہے۔

تبسُّم نے اپنی کتاب کا نام بڑا انیق ونادر چُنا ہے۔ کسی کی سوچ اور فکر تک، خاص کر موزوں کلام تخلیق کرنے والے کی تخئیل کو گرفت کرنا کارِدارد...... ''جہاں نہ پہنچے روی وہاں پہنچے کوی'' (سورج کی ضوءفشانی کی بھی جہاں تک رسائی نہ ہو، شاعر کا ذہنِ رسا وہاں پہنچ جاتا ہے) شاعری شاعر کے تخیُّلات اور سوچ کی جادُوگری ہی تو ہوتی ہے اور جادُو تو وہی ہے جو سر چڑھ کے بُولے۔ کتاب میں آپ جابجا تبسّم کی فکر کی پرواز دیکھیں گے اور قائل ہو جائیں گے کہ شاعرہ نے اپنی نظمیہ تخلیقات میں کیا کیا سمُو دیا ہے۔

لکھنے کو تو بہت کچھ ہے مگر بس اِس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عمر، توانائیوں اور صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور کلام کو قبُولِ عام بخشے، آمین!

پروفیسر سبودھ لعل ساقیؔ

نوئیڈا،

درد کا حد سے گزرنا...

"
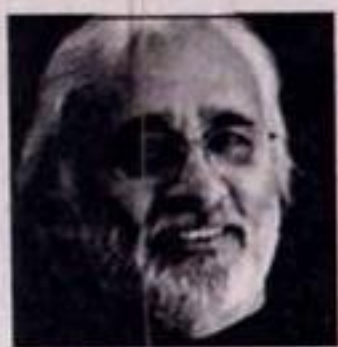
"... یہاں آکر پیاس بجھتی نہیں، اور بھڑک جاتی ہے خدا کرے تبسمؔ کی شاعری کے اور مجموعے بھی جلدی جلدی آتے رہیں"۔ وہ ضرور ایک خدائی پل رہا ہوگا جب میں نے یہ الفاظ تبسمؔ کے پچھلے مجموعے "دھنک" کے سلسلے میں لکھے انہوں نے دھنک میں، نہ جانے کیوں، نظمیں شامل نہیں کیں تھیں۔ نیا مجموعہ "جہاں کوئی نہ ہو" اس کمی کو بھرپور ڈھنگ سے پورا کرتا ہے۔

انٹرنیٹ پر اکثر تبسمؔ کی نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میرے جیسے بھی fans ان کی نظموں کا انتظار کرتے ہوں گے مجھے ان کی نظموں کا انتظار اس لئے رہتا ہے کہ ان کی تقریباً ہر نظم میں ندرت نظر آتی ہے۔ مجھے ان کی نظموں میں کئی دلکش رنگ ملتے ہیں۔ کہیں زندگی سے جڑے مسائل پر گہری سوچ تو کہیں روزمرہ پر فلسفیانہ نظر؛ کہیں حالات حاضرہ کا بیباک تذکرہ تو کہیں ماضی کے گلیاروں میں دلچسپ تلاش ان کی ہر نظم قاری کے دل

وذہن تک پہنچتی ہے "جہاں کوئی نہ ہو" آپ کے ہاتھوں میں ہے؛ صفحے پلٹیے اور ہر نظم میں خود کو کسی دلفریب پہلو کے روبرو پایئے۔

جی چاہتا ہے کہ تبسم کی نظم "محبّت" یہاں پوری کی پوری quote کروں لیکن شاید نظم کے کچھ مصرعے ہی اس بات کو واضح کردیں جس پر میں روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ جذبات کی دنیا کے ایک سنجیدہ پہلو میں تہ در تہ نئے زاویے، نئے حوالے:

تھوڑی سی تڑپ
تھوڑا سا دھیر
ہے موم سا
اس کا خمیر
دوجے کی پیڑ
دے دل کو چیر
نینوں کے تیر
بھر لائے نیر
نازک سا کانچ
مدھم سی آنچ
شیریں کلام
دلکش پیام

جامِ طہور

چڑھتا سرور

جلوہ ءطور

سرتا پا نور

کھلتا گلاب

چندا کی تاب

موتی کی آب

عفت مآب

بقول غالب ''یہ مسائل تصوّف یہ ترا بیان۔۔۔!جی...اس نظم کی روانی،اس کی برجستگی اس بات کی گواہ ہیں کہ تبسّم کی گہری سوچ قاری کے ذہن پر بوجھ نہ بن کر مسرّت کا حوالہ بن جاتی ہے۔

تبسّم کی شاعری کا ایک اہم باب ان کی انسان دوستی ہے معاشرے کا درد ان کے کلام میں ایسے ابھر کر آتا جیسے وہ اسے ذاتی طور پر محسوس کرتی ہوں ہمارے سماج میں آج بھی عورت کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا جس کی وہ حقدار ہے۔تبسّم اس بات کو شدت سے محسوس کرتی ہیں ان کی مختصر نظم دیوتا اس نظریے کی بھرپور تائید کرتی ہے۔

جانے کون تھی بیچاری

سدھ بدھ سے عاری

تکلیف سے بیکل

تڑپ رہی تھی

کرب کی حالت میں اپنے

جسم پہ جھولتے چیتھڑوں کو

چندی چندی کرڈالا تھا

اور کبھی

سر کے

میلے بکھرے بالوں کو

اپنے گندے ناخن سے

زور زور سے نوچنے لگتی

درد کی شدت کے باعث

اس کی چیخیں

آسمان کو چھونے لگی تھیں

--

کوئی فرشتہ تھا شاید

جس نے مدد کی ہے اس کی

اسپتال پہنچایا بروقت''

اگلے پل ہی

نرس نے جیسے

کان میں سیسہ انڈیل دیا ہو

وہ بھی کوئی دیوتا ہوگا؟

جس نے اس پگلی کو

ایسا تحفہ دیا ہے"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تبسم کی تمام شاعری کو ایک عنوان کے تحت سمویا جا سکتا ہے اور وہ عنوان ہے "درد" درد کے الگ الگ روپ کہیں سماج کے آئینے میں نظر آتے ہیں تو کہیں نسل انسانی کی لغزشوں میں نظم فطرت دیکھئے:

ازل سے پھول اور کانٹے

گو رہتے ساتھ ہیں لیکن

وتیرہ کانٹوں کا

پھولوں نے اپنایا نہیں ہرگز

نہ ہی کانٹوں نے پھولوں سے

ادائے زندگی سیکھی

نہ اس نے وضع بدلی ہے
نہ اس نے اپنی خو چھوڑی

--

گلوں کی اعلیٰ ظرفی
آج بھی ویسی ہی قائم ہے
اذیت دینے کی فطرت
وہی کانٹوں کی ہے اب بھی

--

جو درد تبسم لگاتار محسوس کرتی ہیں اسے چھپانے کے طریقوں سے بھی وہ خوب واقف ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درد یا تو حد گزر کر دوا بن چکا ہے یا انہوں نے اس سے سمجھوتا کر لیا ہے اور اس تعلّق کو وہ نہایت شاعرانہ طریقے سے نباہتی ہیں الہام، پیاس، رسہ کشی، پرداوغیرہ کی نظموں میں یہ رنگ نمایاں ہے میرے لئے ان کی مختصر نظم فاصلے اس سمجھوتے کی آئینہ دار ہے:

شام ہوتے ہی نوکِ مژگاں پر
یاد کے جگنو رقص کرتے ہیں
ذہن کے کینوس پہ تصویریں
بنتی، مٹتیں، بگڑتی رہتی ہیں

دل کے گولک میں خوشنما لمحے

بن کے سکے ٹھہر سے جاتے ہیں

خواب آنکھوں سے اشک کی صورت

قطرہ قطرہ بکھرنے لگتے ہیں

جنگ امید و بیم کے مابین

یونہی جاری ہمیشہ رہتی ہے

خواب و تعبیر کے اسی صورت

فاصلے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں

تبسّم اکیسویں صدی کی ہندوستانی شاعرہ ہیں۔ ان کے کلام میں آج کا ہندوستان، آج کی گنگا جمنی اردو، آج کے تقاضے نظر آتے ہیں یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ غزل آج کی شاعری کی نمائندگی نہیں کرسکتی لیکن یہ کہنے میں مجھے جھجھک محسوس نہیں ہوتی کہ جن موضوعات کی شاعری تبسّم کرتی ہیں ان کے لئے نظم ہی صحیح صنف ہے ان کے یہاں مقصدیت کے ساتھ بوسیدہ روایات کو للکارنے کا حوصلہ بھی ہے؛ ان کے الفاظ میں اگر بیان کی چاشنی کا ذائقہ ملتا ہے تو ساتھ ہی صاف گوئی کے نمونے بھی، ایسی تمام صفات تبسّم کو نظم کی دنیا میں ممتاز نام دیں گی، نظم کی دنیا کے ایک باشندے کی حیثیت سے میں ان کا یہاں پر جوش استقبال کرتا ہوں۔

چھوٹی چھوٹی نظموں میں بڑی بڑی باتیں کہنا آپکا حصّہ ہے، تبسّم!

اخلاق بندوی
رزینہ رزیڈنسی، نذیر آباد
شاہ گنج، جونپور

تبسّم کی تجسیم

طاہرہ تبسم اعظمی کا نام میرے لئے اگر چہ نیا نہیں ہے، لیکن ان سے میرا تعارف پرانا بھی نہیں ہے۔ عرصہ دراز سے ان کا کلام مختلف رسائل وجرائد میں گاہ گاہ نظر آتا رہا ہے اور میں یونہی پڑھ کر گزر جاتا رہا ہوں۔ مجھے ان کے کلام میں کچھ دلچسپی تھی تو صرف اس بناء پر کہ وہ میری ہم وطن ہیں۔ برقی مواصلات اور سوشل میڈیا کے مختلف وسائل نے دنیا کی وسعتیں سمیٹ کر کفِ دست پر رکھ دی ہیں۔ لہٰذا فیس بک کے مختلف گروپ اکاؤنٹس پر ان کا ذکر جب معتبر ادبی شخصیات کے درمیان ہونے لگا اور ان کے کلام پر تبصروں کی گل پاشی کی جانے لگی تو انھیں گل ہائے رنگا رنگ میں خاکسار کے اچھالے ہوئے کچھ برگِ شجر بریدہ بھی شامل ہونے لگے۔ انھیں تبصروں کا زینہ چڑھ کر آج اس بامِ تقریظ تک رسائی ہوئی ہے جہاں تبسّم کے کلام سے ہم کلام ہوں۔

شاعری ایک منطقی خیال ہے۔ لیکن ہر منطقی خیال شاعری نہیں ہوتا۔ کسی خیال کو شعر ہونے کے لیے موزوں الفاظ میں ڈھلنا ضروری ہے۔ الفاظ کی یہی موزونیت جس قدر مستحکم ہوتی ہے خیالات کی ترسیل اسی قدر منظم ہوتی ہے۔ خیالات کی منظم ترسیل کا یہی تسلسل نظم کہلاتا ہے۔ اردو کی روایتی نظمیں ادب کے قائم شدہ اصولوں کی پابند ہیں جن میں بحر، وزن، ردیف، قافیہ اور دیگر رموز کی پابندی لازم ہوتی ہے۔ یہ غزل کے اسلوب پر بھی کہی جاسکتی ہیں بلکہ غزل کا ہر شعر بذاتِ خود ایک نظم ہوتا ہے۔ نظم کی مختلف اصناف ہیں، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ اور گیت وغیرہ۔ ان پابند نظموں کے علاوہ اپنی ساخت اور ہیئت کی بناء پر نظم کی کئی اور اقسام اردو میں رائج ہیں جن میں معریٰ، آزاد، اور نثری نظمیں قابل ذکر ہیں۔ اس پر مستزاد انگریزی ادب کی چودہ مصرعوں پر مشتمل مقبول صنف سانیٹ، تین مصرعوں کا قدیم جاپانی سخن ہائیکو، ہندی زبان کی معروف کویتا دوہا، پنجاب کے ڈیڑھ مصرعے کا لوک گیت ماہیا اور فرانسیسی شاعری کے آٹھ مصرعوں کا بند ترائیلے اردو نظم کے جدید ماخوذات ہیں۔

اردو ادب کے امروز پر نظر ڈالیے تو لگتا ہے مثنوی کو زمانے کی نظر لگ گئی، قصیدہ اہل بیت کے دامن میں پناہ گزیں ہو گیا اور مرثیہ تو کب کا صحرائے کرب و بلا کے ذرات میں گم ہو چکا، ماضی کی روایات کے برخلاف اب ہر سخنور شاعری کی ابتدا غزل سے کرتا ہے۔ بیانیہ کے اظہار کا واحد ذریعہ موضوعاتی نظم رہ گئی ہے جو مختلف عنوانات سے شعرا کے تصرف میں آتی ہے۔ لہٰذا اردو نظم کی تعریف میں یہ کہ دینا کافی ہوگا جو کلام غزل نہیں ہے وہ نظم ہے۔

تبسم اعظمی نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے ان کی غزلوں کا

مجموعہ ''دھنک'' اپنی ساری رنگینیوں کے ساتھ منظر پر آچکا ہے۔ دھنک میں غزلیات کے علاوہ کچھ نظمیں (سانٹ) بھی شامل اشاعت ہیں۔ غزل ایک لاشعوری کیفیت کے اظہار کا شعور ہے جب کہ نظم شعوری کیفیت کا لاشعوری اظہار۔ تبسّم اعظمی جس معاشرے سے آتی ہیں ان کا شاعرہ ہونا ہی بذاتِ خود ایک معجزہ ہے۔ ان کی زندگی میں لاشعوری کیفیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لئے ان کی غزلیں معتدل اور باحجاب نظر آتی ہیں، البتہ ان کی نظموں میں شعور وآگہی کی وہ فضا پائی جاتی ہے جو معاشرے کے فرسودہ نظام کے خلاف آواز بلند کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ لیکن تبسّم اعظمی یہاں بھی محتاط نظر آتی ہیں اور اپنی تہذیبی بندشوں سے گریز پا نہیں ہو پاتیں۔ ان کی نظموں کا آہنگ ایستادہ چہار دیواری کے اندر ہی بازگشت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

تبسّم اعظمی کی نظمیں پڑھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو تبسّم ان کی نظموں میں جی رہی ہے اس نے بڑی آرزو اور تمنا کے ساتھ ایک راہ چنی تھی اسے یقین تھا یہی وہ رہگزر ہے جو اسے منزل مقصود تک لے جائے گی، لیکن آخر کار جس منزل پر وہ خود کو پاتی ہے اس منزل کی اسے جستجو ہی کب تھی اور زندگی کے اسی فلسفے میں الجھ کر رہ جاتی ہے کہ تیرگی میں سائے گریزاں کیوں ہوتے ہیں، مضمحل گلوں سے خوشبو پریشاں کیوں ہوتی ہے اور ہر موج امید کی کشتی کیوں ڈبوتی ہے؟

کب اندھیرے میں
کوئی سایہ چلا ہے ہمراہ

پھول مرجھایا تو

خوشبو نے نگاہیں پھیریں

جس سے امید تھی پہنچائے گی ساحل تک

اور اسی لہر نے کشتی کو ڈبویا بھی ہے"

(سلسلہ۔تبسّم اعظمی)

پھر ایسا لگتا ہے گویا انھوں نے اپنے کلام میں اپنا دوسرا وجود خلق کر لیا ہے۔ جہاں سماں حسین ودلنشیں ہے، فضا حیات آفریں ہے، چہار سمت نور ہے اور ہواؤں میں سرور ہے۔ جہاں چاندنی دھرتی کے فرش پر اپنا نور بچھاتی ہے اور شبنم پھول کے کاسے میں موتی لٹا تی ہے، جہاں یقین وعزم کی شمعیں جلتی ہیں، جل پریاں جھرنوں میں رقص کرتی ہیں، چاند بادل سے اٹکھیلیاں کرتا ہے، ستارے جھیل میں اترتے ہیں اور رات رانی کی بھینی بھینی خوشبو سارے ماحول کو مسحور کر دیتی ہے، صبا کا لمس کلیوں کا قبائے گل عطا کرتا ہے اور تتلیاں پھولوں سے سرگوشیاں کرتی ہیں، ایک ایسا وجود جسے پھولوں کے تبسم سے ''خراشیں'' آتی ہیں، جس کے اشک رب کائنات سے یوں محو گفتگو ہوتے ہیں۔

ہے شب کا تیسرا پہر

جھکا ہے تیرے در پہ سر

کرم کی ڈال کر نظر

مجھے بنا دے معتبر

گناہگار ہوں تری
خطائیں بخش دے مری
قبول کر مری دعا
مرے خدا مرے خدا"

(ہم نشیں۔ تبسم اعظمی)

اور بظاہر لگتا ہے اپنی "عزتِ نفس" کو بچا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن خدا نے آدم کی تخلیق سے قبل ہی ان کے مسکن کا انتظام کر دیا تھا اور انھیں خلدِ بریں میں رکھا تھا۔ تبسّم اعظمی نے جو اپنا وجود ثانی تخلیق کیا ہے اس کی جنت کہیں نہیں تھی۔ اسے تو اسی جبر و تشدد کی دنیا میں سانس لینی تھی، زمانہ قدیم سے قائم فرسودہ نظام کی تلخیاں گوارا کرنی تھیں اور ظلم و استبداد کی بھٹی میں جلنا تھا۔ اس نے نامساعد حالات کی صعوبتیں برداشت کیں۔ فرطِ غم میں آنسو بہائے، زندگی بھر کی تنہائی کا زہر پیا پھر بھی اپنی ذات اپنی نہ ہوئی انھوں نے اپنے ہمزاد کی سکونت کے لیے جس جہانِ نو کا خواب دیکھا تھا اس کی تعمیر کا فن ان کی نظم "فن" میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

وہ شاخ مضبوط ہو یا نازک
یہ منحصر ہے کمالِ فن پر
کہ کیسے تنکوں کو جوڑنا ہے
مہین ریشوں کے تانے بانے

سے کیسے دیوار جوڑنی ہے

--

کہاں بنانا ہے در کہاں پر
جگہ دریچے کی چھوڑنی ہے
جہاں سے بادِ صبا تو آئے
درونِ خانہ چلے جو آندھی
گرانے پائے نہ آشیانہ

--

خلوص و انس و وفا کی روئی
یقین و ایثار کے عناصر
جو ہوں گے تعمیر میں یہ شامل
تو شاخ نازک پہ بننے والا بھی
آشیاں پائیدار ہوگا

(فن۔ تبسم اعظمی)

تبسم اعظمی کا وجود ثانی کسی دیومالائی کہانی کا کوئی کردار نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا انتخاب ہے۔ اپنا آئیڈیل ہے وہ اسی کردار کو جینا چاہتی ہیں۔ لیکن یہ مقام جہان آب وگل ہے تخیلات کی دنیا نہیں۔ یہاں ''آنکھیں تو ہیں جو ہر چیز دیکھتی ہیں لیکن درد کی پردہ پوشی نہیں کرتیں یہاں ''فطرت'' میں اگر پھول اپنی ادائے زندگی نہیں بدلتے تو کانٹے بھی اپنی اذیت رسانی کی خو نہیں چھوڑتے۔ یہاں کا ہر جذبہ مجاز اور ہر حقیقت ''سراب'' ہے۔ ''انسان'' تو گویا موسموں کی مار جھیلتا شجر ہے بالکل اسی ''چاک کی مٹی'' کی طرح جس کا افسانہ سندر روپ میں سنورنا اور بالآخر ٹوٹ کر بکھر جانا ہے۔ یہاں ننھی زینب کی معصومیت ہو یا اسّی سالہ ضعیفہ کا تقدس، سب کچھ اسیرِ پنجۂ ہوس ہے۔ کیا پتا ''خوف'' کا عفریت کب کسی غنچے کو مسل دے اور زمین لال ہو جائے۔ یہاں ٹوٹتے بکھرتے تعلقات کی ''تجدید'' ممکن تو ہے لیکن کون سا ٹوٹا ہوا دھاگا بغیر گرہ کے جوڑا جا سکتا ہے اور کون سا شکستہ آئینہ ہے جس میں بال نظر نہیں آتا؟ اور سچ پوچھئے تو یہاں ''زندگی'' موت سے ظالم ہے، روح قسطوں میں کھینچتی ہے زندگی بھر آدمی خود اپنی میت ڈھوتا ہے اور ایک دن اپنے اندر ہی دفن ہو جاتا ہے اور اس اذیت بھری زندگی کے طویل سفر کا ''انعام'' سرابِ دائمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تبسّم اعظمی نے اپنی نظموں کے اندر جس وجود ثانی کی تجسیم کاری کی ہے وہ ایک ایسے کردار کو جنم دیتی ہے جس کی انگریزی ادب کے شاعرِ فطرت ورڈز ورتھ نے تمنا کی تھی، لوسی گرے ایک معصوم بچی ہے جو انسانی آبادی سے کہیں دور فطرت کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔لیکن جیتے جاگتے انسانوں کے اس جہان میں زندگی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ ورڈز ورتھ اپنی لوسی گرے کو اس دنیائے رنگ و بو میں زندہ نہیں رکھ سکا۔

تبسّم اعظمی ظالم دستور کے خلاف لڑتی ہیں، حریت کا پرچم لہراتی ہیں، اپنی ہم جنس کے حقوق کی پامالی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں۔ انفرادی پہچان کے لیے جدوجہد کرتی ہیں، پاؤں کے آبلوں کو زنجیر نہیں ہونے دیتیں اور اپنی تبسم کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ میری نظر میں تبسّم اعظمی کی نظمیں لوسی گرے کے معصوم قدموں کے وہی ننھے نقوش ہیں جو برفانی طوفان کے بعد پگڈنڈی کے پل کی سطح پر ابھر آئے ہیں۔

تبسم اعظمی

سرائے میر

اعظم گڑھ

دھوپ چھاؤں کا سفر

آنکھوں دیکھے مناظر، دلی احساسات، جذبوں کا عکس، سوچ کے زاویے، تصورات کی پیکر سازی، تخیلات کی مصوری کو ذہن کا لفظوں کے تانے بانے میں بنکر نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا نظم یا نثر کہلاتا ہے۔

ظاہر ہے یہ مرحلہ آسان نہیں، نظم کی مالا پرونے میں جہاں تخیلات کے گلشن میں خوبصورت پھولوں کی مسحور کن خوشبو روح کو معطر کرتی ہے، وہیں تجربات ومشاہدات کی وادی میں کانٹوں کی باڑھ سے بھی سابقہ پڑتا ہے، راہ میں پیچ وخم بھی ملتے ہیں اور نشیب وفراز بھی آتے ہیں، کبھی زمین ہموار ثابت ہوتی ہے، کبھی ناہموار، کبھی پتھریلی تو کبھی نرم۔ بہر کیف!

''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے''

سو اس سفر میں بھی مسافر نوازوں کی کمی نہیں رہی، کہیں سنگ وخشت راہ کا روڑہ بنے، تو کہیں شجرِ سایہ دار نے استقبال کیا، کبھی دیوار حائل ہوئی، کبھی سارے پردے ہٹے

گئے، دعاؤں نے سہارا دیا، محبتوں نے مہمیز کیا، شفقتوں نے حوصلہ بڑھایا، سب سے اہم بات خدا کا کرم جب ساتھ ہو تو راہ سے راہ نکلتی رہتی ہے۔ بس اسی کی مہربانیوں کے طفیل قلم کا سفر جو اوائل عمری میں شروع ہوا تھا وہ غزلوں کی ''دھنک'' سے گزر کر الحمدللہ اپنے دوسرے پڑاؤ نظموں کی دنیا ''جہاں کوئی نہ ہو'' تک پہنچا ہے۔

کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہیں، اگر میرے معمولی فن پارے آپ کے دل و ذہن میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تو یہی میری کامیابی ہوگی۔

میں محترم ستیہ پال آنند صاحب، عزیز الدین خضری صاحب، سبودھ لعل سر، اور اخلاق بندوی صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان محترمین نے کتاب کو اپنے بیش قیمت تاثرات اور دعاؤں سے نوازا۔ ساتھ ہی اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد آصف صاحب اور تمام قارئین کی شکر گزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی و پذیرائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔

نظمیں

(۱)

ہم نشیں

سماں حسین و دلنشیں
فضا حیات آفریں
یہ پھیلی پھیلی چاندنی
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی
چہار سمت نور ہے
ہواؤں میں سرور ہے
ہوں تجھ سے محوِ گفتگو
کہوں کیا اپنی آرزو
زباں سے کیا کروں بیاں
ہیں اشک میرے ترجماں
کہ تیرے میرے درمیاں
کوئی حجاب ہے کہاں

تو ہم نشین و رازداں
تو مہرباں، قرینِ جاں

--

ہے شب کا تیسرا پہر
جھکا ہے تیرے در پہ سر
کرم کی ڈال کر نظر
مجھے بنا دے معتبر
گناہگار ہوں تری
خطائیں بخش دے مری
قبول کر مری دعا
مرے خدا مرے خدا

--

(۲)

جہاں کوئی نہ ہو

چاند
سورج
کہکشاں
آسماں
زمیں
خلاء
پاتال، سے پرے
ہر بشر کی ہے
کائنات الگ

--

جہاں
نہ سرحدیں
نہ بندشیں

نہ دائرہ کوئی

اڑان ہی اڑان

تخیلات کی بلندی

تصورات کا پھیلاؤ

یہاں سے

وہاں تک

جہاں کوئی نہ ہو

--

(۳)

محبت

ہیرے کی ڈلک
کندن کی دمک
روپا کی چمک
تاروں کی جھمک
ساون کی دھنک
پروا کی سنک
ڈالی کی لچک
کلیوں کی چٹک
پھولوں کی مہک
چڑیوں کی چہک
چوڑی کی کھنک
پایل کی جھنک
جذبوں کی ہمک

شعلوں کی لپک
آشا کا فلک
آنسو کا نمک
میٹھی سی کسک
ہلکی سی خلش
تاثیر کشش
جادو سا اثر
انداز جنوں
بے خوف و خطر
سپنوں کا گگن
حسرت کی زمیں
خوش رنگ گماں
مضبوط یقیں

--

تھوڑی سی تڑپ
تھوڑا سا دھیر
ہے موم سا

اس کا خمیر
دوجے کی پیڑ
دے دل کو چیر
نینوں کے تیر
بھر لائے نیر
نازک سا کانچ
مدھم سی آنچ
شیریں کلام
دلکش پیام
جامِ طہور
چڑھتا سرور
جلوہء طور
سر تا پا نور
کھلتا گلاب
چندا کی تاب
موتی کی آب
عفت مآب

--

دل کی نوید
دھڑکن کی عید
مسحور حسن
مخمور عشق
دلبر کا ناز
عاشق کی آن
رادھا کا رقص
مرلی کی تان
میرا کا جوگ
صوفی کی شان
مندر کا دیپ
مسجد کا دوار
راکھی کی ریت
پھاگن کا پھاگ
جھرنوں کا گیت
پربت کا راگ

ساحل کا چین
لہروں کا شور
مخمل کا لمس
ریشم کی ڈور
اس پر چلا
کب کس کا زور
ہونٹوں پہ چپ
آنکھوں میں بول
احساس کے
پلڑے میں تول
الفت کا روپ
ہے چھاؤں، دھوپ
قدرت کی دین
اس کا سروپ

--

جو سوز سے
معمور ہو

اس قلب میں
بستی ہے یہ
ہر شاخ پر
کھلتی نہیں
ہر دل کو یہ
ملتی نہیں ہے

--

(۴)

حیرت

جل پری رقص کیا کرتی تھی، جھرنوں میں
گوہساروں سے اُبھرتے تھے، ترانے دلکش
چاند اٹکھیلیاں کرتا تھا، سدا بادل سے
جھیل میں، عکس ستاروں کے اُترتے تھے جہاں
رات رانی کی وہ مدمست مہک
سارے ماحول کو، مسحور بنا دیتی تھی
اور سورج کی حسیں شوخ کرن
چھُو کے ہولے سے، گزرتی تھی جو کلیوں کو
تب صبا چُپکے سے، کچھ کان میں کہہ دیتی تھی
دل نشیں رنگ کئی چہرے پہ کھُل جاتے تھے
پھول، تتلی سے کیا کرتے تھے، سرگوشی جب
اُس کی صنّاعی میں کھو جاتی تھی دنیا جس پل

--

میں دبے پاؤں چلی آتی تھی، ذہنوں میں
اور، آنکھوں میں اُترتی تھی چمک کی صورت
سوچ کے کتنے ہی در کھلتے، چلے جاتے تھے
نبضِ فطرت سے جو واقف تھے، اُنھیں
میکدہ لگتا تھا گلشن سارا
پھول پیمانے کی مانند نظر آتے تھے
شاعروں نے مجھے، اشعار کا جامہ بخشا
اور مصور نے عطا کی مجھے دلکش صورت
کوئی انہونی جو ہو جائے کبھی
درمیاں ہونٹوں کے، ہلکا سا شگاف
میرے ہونے کا پتہ دیتا تھا

--

اب تو لگتا ہے کہ جیسے
لُو سے کر لی ہو صبا نے بیعت
چشمِ کہسار سے بہتے ہیں، لہُو کے جھرنے
موجِ دریا سے اُبھرتی نہیں، سرگم کوئی
چاند پر چھایا گہن کا سایہ

تتلیاں سہمی ہوئی لپٹی ہیں شاخوں سے
اور، غنچے بھی سراسیمہ نظر آتے ہیں

--

حادثے لاکھ ہوں
احساس پہ طاری ہے جُمود
چونکتے ہی نہیں اذہان کسی بات پہ اب
اور ہونٹوں پہ مُسلسل ہے خُموشی کا قیام
میں جو آنکھوں میں اترنا چاہوں
مجھ سے پہلے وہاں ویرانی پہنچ جاتی ہے
گردشِ وقت نے اِس طور مناظر بدلے
ایسا لگتا ہے کہ اب، میری ضرورت ہی نہیں

(۵)

ہموار

نقش مٹتا ہے
تو مٹ جائے
قدم ہیں ثابت
موج سرکش ہے اگر
ہم بھی بہت ضدی ہیں

--

روز اک نقش نیا ثبت کریں گے یونہی
پر اگر کٹ بھی گئے
حوصلہ شہپر ہو گا
جاری تخئیل کی پرواز رہے گی یونہی

--

ہم نہیں دریاؤں کے انجام سے ڈرنے والے
راستہ کر کے سمندر کو گزر جائیں گے

(۶)

آئینہ

اِس طرف آئینہ
اُس طرف آئینہ
جس طرف دیکھئے
ہر طرف آئینہ
خوشنما آئینہ
بدنما آئینہ
پُر یقیں آئینہ
بدگماں آئینہ

--

بات سچی کہے
روبرو آئینہ
کس قدر ہے نڈر
صاف گو آئینہ
صاف شفاف ہے
گرد آلود ہے

قلب کا آئینہ
ذہن کا آئینہ
آنکھ کا آئینہ
روح کا آئینہ

--

شہر کا آئینہ
گاؤں کا آئینہ
دھوپ کا آئینہ
چھاؤں کا آئینہ
زیست کا آئینہ
بخت کا آئینہ
سب سے بے درد ہے
وقت کا آئینہ
بس ذرا ٹھیس سے
ٹوٹتا آئینہ
بال آجائے جب
کب جڑا آئینہ

--

محتسب آئینہ

منقلب آئینہ

منعکس آئینہ

منکشف آئینہ

اپنے ہر روپ میں

مختلف آئینہ

سنگ پھر سنگ ہے

آئینہ آئینہ

--

جو دکھاتے رہے

دوسروں کو سدا

تلملاتے ہیں کیوں

دیکھ کر آئینہ

سب سے بڑھ کر ہے بس

آدمی کا ضمیر

اِس سے بہتر نہیں

ہے کوئی آئینہ

(۷)

اشرف المخلوقات

اس کی بنیاد میں اخلاص کی اینٹیں ہیں چنیں
اس کے محراب میں ایثار کی تختی ہے جڑی
اس کے آڑے نہیں آیا کبھی مذہب کوئی
عرش سے اس کے لیے خاص پیام آئے ہیں
آسمانوں سے فرشتوں کے سلام آئے ہیں

--

دوستی پر کسی مذہب نے نہ خنجر رکھا
کون سے دھرم سے آخر ہے تعلق ان کا؟
جو محبت کو تہِ تیغ کئے دیتے ہیں؟
جن کو پھولوں کا تبسم نہیں بھاتا ہرگز
ہول اٹھتا ہے جنھیں چڑیوں کی چہکاروں سے
جب بھی چھڑتی ہے کہیں پیار کی میٹھی سرگرم
ان کے ماتھے پہ شکن بڑھتی چلی جاتی ہے
بھیڑ کی شکل میں، وحشی درندوں کی طرح

جوق در جوق امڈتے ہی چلے آتے ہیں

گل کو ملا، کبھی تتلی کے پروں کو نوچا

کبھی جگنو کو بجھایا، کبھی شعلوں کو ہوا دی

کبھی پھونکا ہے مکاں اور کبھی بستی ہی جلا دی

آدمی کو کہاں انسان سمجھتے ہیں بھلا

دیکھتے سب کو ہیں مذہب کا لگا کر ٹھپہ

جذبۂ مہر سے احساس سے عاری ہو کر

بربریت کے تلے روند رہے ہیں سب کو

ہوں محبت کے صحیفے، یا مروت کا ورق

بھول بیٹھے ہیں سبھی صوفیوں، رشیوں کا سبق

--

تیری مخلوق سے الفت نہ جو کر پائے کبھی

تجھ سے کس طرح نباہیں کے محبت اپنی

تو نے بھیجا تھا انھیں امن کا پرچم دے کر

یہ ترے نام سے ڈھاتے ہیں ستم دھرتی پر

ان میں وہ وصف نہیں جو ترے نائب ٹھہریں

چھین لے اشرفِ مخلوق کا تاج اب ان سے

(۸)

فاصلے

شام ہوتے ہی نوکِ مژگاں پر
یاد کے جگنو رقص کرتے ہیں
ذہن کے کینوس پہ تصویریں
بنتی، مٹتیں، بگڑتی رہتی ہیں

--

دل کے گولک میں خوشنما لمحے
بن کے سکے ٹھہر سے جاتے ہیں
خواب آنکھوں میں اشک کی صورت
قطرہ قطرہ بکھرنے لگتے ہیں

--

جنگ امید و بیم کے مابین
یونہی جاری ہمیشہ رہتی ہے
خواب و تعبیر کے اسی صورت
فاصلے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں

(۹)

(سبودھ ساقی صاحب کی نظم خالی آنکھیں سے متاثر ہو کر)

تلاش

"*جن آنکھوں کو خالی کہ کر
نفسی ماہر اور شاعر
ذکرِ بیاباں کرتے ہیں*"
ان آنکھوں میں ٹھہرے آنسو
درد کے پہلو
اٹھتے سوال
گردِ ملال
وہم و گماں کی
چلمن کے پیچھے
اک ایسا بھی روزن ہے

--

جہاں یقیں کا سورج ہے پنہاں
آس کی کرنوں کے انکر ہیں

جہاں انتظار کا بستا جنگل
اور آشا کا گلشن ہے
ان آنکھوں میں کرب کے پیچھے
ایک نشانِ طرب چھپا ہے

--

جانے کتنے عرصے سے یہ
ڈھونڈ رہی ہیں اس قاری کو
ان میں نہاں پیغام جو پڑھ لے
ان میں لکھی تحریر کو سمجھے
رنج و الم کے
سونے پن کے
خوف و ہراس و یاس کے سارے
باب مٹا دے
ان میں سنہرے خواب سجا دے
پیار کے دلکش پنوں پر
اپنی وفا کی مہر لگا دے

(*سبودھ لعل ساقی)

(۱۰)

تنہائی

تری آغوش میں سر رکھ کے
کتنے ہی خیالوں کو
قبا الفاظ کی دی ہے
تصور کو دیئے شہپر
تراشے کتنے ہی پیکر
خلاء کے سادہ کاغذ پر
نگاہوں نے بنائی ہیں
کئی دلکش سی تصویریں

--

حسیں کچھ نقش ابھرے جب
تبسم کی کرن پھوٹی
مری خاموشیوں نے کی ہیں
تجھ سے گفتگو اکثر
ملی ہے تیری صحبت میں
سکونِ قلب کی دولت

تھکن سے چور، الجھے اور
پریشاں ذہن کو راحت

--

مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ تیری بزم میں آ کر
با اوقات!
سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں
خلش بن کر ابھرتے ہیں
سبھی بھولے ہوئے چہرے
سبھی مہکے ہوئے لمحے
ستاتی رہتی ہیں من کو
کئی بھولی ہوئی یادیں
کئی بسری ہوئی باتیں
چبھن گزرے ہوئے لمحات کی
نشتر کی صورت
روح میں پیوست ہوتی ہے
فضائے دل میں ہر سو
اک گھٹن سی پھیل جاتی ہے

(۱۱)

ملن

انتظار کی سولی پر
کتنے روز و شب کاٹے
پتھر جیسے لمحوں میں
صدیوں جیسے پل گزرے
آج مگر دل کی دنیا کا
سارا نقشہ بدل گیا ہے
من کے سیپ میں پیار کا امرت
قطرہ قطرہ اتر رہا ہے
دھڑکن کے تاروں نے
ایک نئی دھن چھیڑی ہے
سانس کی خوشبو
دل کی سرگم
سب کچھ کتنے پاس ہے لیکن

--

لفظوں سے ناطہ ٹوٹا
حلق میں گولا سا اٹکا ہے
ہونٹ سلے ہیں، جذبے جامد
سارا عالم ہی ہے ساکت
وقت کا دھارا ٹھہر گیا ہے
آنکھوں میں گھنگھور گھٹا ہے
نظریں آخر دیکھیں کیسے
سارا منظر دھندلایا ہے

--

(۱۲)

فرض

صدا سنتے تو ہیں،

لیکن!

نئے رہرو کو لگتا ہے

کہ یہ دیوانے کی بڑ ہے

انھیں شاید نہیں معلوم

یہ دیوانگی برسوں

رویّوں کے بیابانوں کی سیاحی سے آئی ہے

--

وہ ناداں ہیں

ہواؤں کے بدلتے رخ کا

اندازہ نہیں ان کو

مشاہدات و تجربات کی تلخی سے ناواقف

ابھی خوابوں میں جیتے ہیں

--

مگر ہم کو!

صدا یونہی لگانی ہے

انھیں آگاہ کرنا ہے

سنبھلنا ہے کہاں

کب تیز قدمی کی ضرورت ہے

سفر میں زندگانی کے

کچھ اندھے موڑ آتے ہیں

کئی ایسے گڑھے بھی ہیں

جہاں سے گرنے والے کا

نکلنا ہے، بہت مشکل

--

یہ ممکن ہے صدا اپنی

صدائے بازگشت ہی بن کے رہ جائے

ہمیں لیکن ہمارا فرض

ہر صورت نبھانا ہے

--

(۱۳)

شخصیت

بٹھا کے کاندھے پہ لائی تھی رات اسے
شفق نے ہنس کے کیا تھا استقبال
ہوا نے راگنی چھیڑی، فضا میں گیت گھلے
سجا کے پتوں کی تھالی میں اوس کے جگنو
اتاری تھی پیڑوں نے آرتی اسکی

--

مگر بلندی پہ آکر بدل گئے تیور
شکن غرور کی پیشانی پر جھلکنے لگی
نگاہ قہر و حقارت سے دیکھتی سب کو
مزاج گرم ہوا، اور گرم، اور بھی گرم
جنون سر میں فقط میں کا ہی سمایا رہا

--

اور اس گھمنڈ میں وہ بھول بیٹھا ہے

کہ اس کے پیچھے ہی ہے شام کا سایا

زمیں بلندی کی ہوتی نہیں ہموار کبھی

یہاں پہ شخص نہیں، شخصیت ٹھہرتی ہے

(۱۴)

کانچ کی چوڑیاں

لوریاں، بولیاں
سسکیاں، ہچکیاں
شوخیاں، بجلیاں
پریم کی ڈوریاں
بجتی شہنائیاں
ہنستی رعنائیاں
نور کی کہکشاں
رنگوں کا کارواں
درد کی ترجماں
پیار کا آسماں
بے زباں، با زباں
ایسی ہیں رازداں
راز کردیں عیاں

اِن کی لے میں نہاں
انگنت داستان

--

لہر احساس کی
عکس جذبات کا
کرب حالات کا
نقش سوغات کا
جیت اور مات کا
دھیمی دھیمی امنگ
میٹھی میٹھی ترنگ
دلنشیں، شوخ و شنگ
اِنکے سر تال سے
دل کے ایوان میں
بج اٹھے جلترنگ

--

تھوڑی حیران سی
کچھ پریشان سی

آس کی شمع ہیں
یاس کا ہیں دھواں
پر یقیں، پر یقیں
بدگماں، بدگماں
مضطرب مضطرب
منقلب منقلب
منتشر منتشر
جانے کس کی ہیں یہ
منتظر منتظر

--

خواب بنتے ہوئے
پھول چنتے ہوئے
گنگناتی ہیں جب
من کے ہر تار سے
پھوٹتی ہے طرب
سیمیں ہاتھوں میں ان
کی مدھر سی کھنک

باندھتی ہے سماں
گھول دیتی ہے رس
ڈوئی کے ساز پر
جب بھی رقصاں ہوئیں
پیت کی خوشبوئیں
دل کے در تک گئیں
سل پہ بٹے کے سنگ
جب بھی سنگت ہے کی
ایک دُھن سی چھڑی
روح کو چھو گئی

--

اِن کے ہر گیت میں
اِن کے ہر ساز میں
کتنے پیغام ہیں
کیسے الہام ہیں
جاگے ارمان بھی
سوئے طوفان بھی

مان سمان بھی
اپنی پہچان بھی
چند اشارات میں
کچھ کنایات میں
شیریں نغمات میں
بات ہی بات میں
کتنا کچھ کہتی ہیں
کانچ کی چوڑیاں

(۱۵)

لمس

لال چنری تلے
ایک لرزش سی تھی
مانو بچہ کوئی
اپنا پہلا قدم
ڈرتے ڈرتے اٹھانے کی کوشش کرے
دل میں کتنے ہی جذبات تھے موجزن
دھیمی دھیمی خوشی
جیسے منھ بند کلیوں کے
ہونٹوں تک آنے کو
مچلے ہنسی

--

ابر نیساں کی بوندوں کے اندیشوں سا
ہلکا ہلکا یہ ڈر
جانے قسمت

شراروں پہ ڈالے؟ کہ بخشے صدف؟

بلبلے کی طرح مٹ نہ جاؤں کہیں؟

--

شاخ سے ٹوٹتے برگِ لرزاں کی مانند

سہمی ہوئیں دھڑکنیں

بھیگی آنکھوں میں گزرے دنوں کی جھلک

ذہن میں اگلے لمحات کے وسوسے

--

اُس کنارے سے

اِس چھور تک کا سفر

وہم و خدشات کے

دائرے میں گھِرا تھا مگر!

معتمد ہاتھ کے

معتبر لمس نے

عمر بھر کی رفاقت کا بخشا یقیں

(۱۶)

انعام

عقل کو کر کے مقفل

فکر کو پہنا دی بیڑی

کان، آنکھیں، نطق، سب

رہبروں کے پاس گروی رکھ دیئے

اندھے، بہرے، گونگے ہو کر

جس طرف ہانکے گئے

چلتے رہے

بے بصر تقلید کے انعام میں

اک سرابِ دائمی ہم کو ملا

--

(۱۷)

تذبذب

ارادے لاکھ ہوں ثابت قدم لیکن
تذبذب کے بیاباں میں
بھٹک جاتے ہیں یہ اکثر
یہاں رستوں کا ایسا جال ہے جس میں
الجھ جاتے ہیں راہی اور
دِشائیں کھو سی جاتی ہیں
ہر اک رستہ کسی دوراہے پر ہی ختم ہوتا ہے
کسی بھی فیصلے کو حتمی صورت مل نہیں پاتی۔

--

(۱۸)

انکار

منال و دولت

یہ جاہ و حشمت

نشانِ عظمت

منارِ شہرت

خرد، فراست

یہ سارا کچھ بس

عطا ہے رب کی

جسے وہ چاہے

نواز دے گا

وہ جس سے چاہے گا

چھین لے گا

--

تو پھر زمیں کے خداؤ!

بولو!

غرور کیسا؟

اکڑ یہ کس پر؟

فرعونی ارمان دل میں کیوں ہے؟

ہر آنے والا!

تمھاری چوکھٹ جبیں سے چومے؟

تمھاری ابرو کی جنبشوں پر
قلم کے رہرو چلیں ہمیشہ؟
تمھارے ہونٹوں کی بات لکھیں

تمھاری سوچوں کو لفظ دے دیں
مگر یہ ممکن نہیں ہے ہرگز
ابھی ہے حرمت قلم کی قائم
ابھی قلم کے ہیں پاسباں بھی
ابھی بہت ہیں ضمیر زندہ
جنھیں گوارا نہیں ہے اپنے
قلم کا سودا

(۱۹)

واپسی

عداوت اور نفرت کی
فصیلیں ارد گرد اپنے
بلند اتنی بھی مت کیجیے
کہ خود اپنی ہی سانسیں اس میں گھٹ جائیں

--

جھروکا در گزر کا ہو
ہوا اک کھڑکی معافی کی
کہ جس سے حبس اندر کا
ذرا باہر نکل جائے
خلوص و انس کی ٹھنڈی ہوا
اندر تلک آئے

--

مسافر صبح کا بھولا

جو گھر کو لوٹنا چاہے

تو اسکے واسطے

دل کی زمیں پھر سے کشادہ ہو

ہمیشہ واپسی کا ایک دروازہ کھلا رکھیئے

(۲۰)

تریاق

--طیش سے مسئلے
حل ہوئے ہیں کہاں
آگ سے آگ بجھتی نہیں
کوئی ہتھیار
چھوٹا ہو
یا ہو بڑا
آخرش ہے تو ہتھیار ہی
جب بھی اٹھے گا یہ
چوٹ پہنچائے گا
--
بغض و نفرت،
عداوت کے اس زہر کا
بس محبت ہی تریاق ہے
--

(۲۱)

تجدید

چلو مانا!

کہ تجدیدِ تعلق کر لیا جائے

سرے ٹوٹے ہوئے دھاگے کے

تم بھی ڈھونڈ کر جوڑو!

میں آئینہ کے ٹکڑے چن کے

پہلے کی طرح کر دوں

--

مگر کیا ایسا ممکن ہے؟

کہ جڑ جانے پہ دھاگے میں

نہیں ہوگی گرہ کوئی؟

نہ بال آئینے میں ہوگا؟

--

(۲۲)

میوزیم

جسے دل کہتے ہیں ہم سب
اک ایسا میوزیم ہے یہ
جہاں ہیں
دلربا، دلکش، بھیانک اور
حزیں یادوں کے اسٹیچو
کسی شوکیس میں
مردہ تمناؤں کی ممی ہے

—

کہیں پر ہیں سجے
جذبات کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے
شکستہ، سالم و مضبوط
اور چٹخے ہوئے رشتے
ہیں کچھ بسری ہوئی باتیں
کئی بھولے ہوئے چہرے

--

انھیں کے سنگ رکھی ہیں
یقین و عزم کی شمعیں
امیدوں اور
حسیں خوابوں کی
کچھ دلکش سی تصویریں

(۲۳)

سلسلہ

کب اندھیرے میں

کوئی سایہ چلا ہے ہمراہ

پھول مرجھایا تو

خوشبو نے نگاہیں پھیریں

جس سے امید تھی پہنچائے گی ساحل تک

اور اسی لہر نے کشتی کو ڈبویا بھی ہے

خواب کے کانچ پہ لکھی گئی تحریروں کو

گردشِ وقت مٹا دیتی ہے

اور یہی وقت کبھی

ٹوٹے دھاگوں کے سرے جوڑ دیا کرتا ہے

(۲۴)

زندگی

زندگی موت سے بھی ظالم ہے
روح قسطوں میں کھینچتی ہے یہ
کوئی کندھا یہاں نہیں دیتا
غسل اشکوں سے دے کے زخموں کو
اوڑھنا ہے کفن تبسم کا
اپنی میت کو آپ ڈھونا ہے
اپنے اندر ہی دفن ہونا ہے

(۲۵)

فطرت

ازل سے پھول اور کانٹے
گو رہتے ساتھ ہیں لیکن
وتیرہ کانٹوں کا
پھولوں نے اپنایا نہیں ہرگز
نہ ہی کانٹوں نے پھولوں سے
ادائے زندگی سیکھی
نہ اس نے وضع بدلی ہے
نہ اس نے اپنی خو چھوڑی

--

گلوں کی اعلیٰ ظرفی
آج بھی ویسی ہی قائم ہے
اذیت دینے کی فطرت
وہی کانٹوں کی ہے اب بھی

(۲۶)

فن

وہ شاخ مضبوط ہو یا نازک
یہ منحصر ہے کمالِ فن پر
کہ کیسے تنکوں کو جوڑنا ہے
مہین ریشوں کے تانے بانے
سے کیسے دیوار جوڑنی ہے

--

کہاں بنانا ہے در
کہاں پر
جگہ دریچے کی چھوڑنی ہے
جہاں سے بادِ صبا تو آئے
درونِ خانہ
چلے جو آندھی
گرانے پائے نہ آشیانہ

--

خلوص وانس و وفا کی روئی

یقین و ایثار کے عناصر

جو ہونگے تعمیر میں یہ شامل

تو شاخ نازک پہ بننے والا بھی

آشیاں پائیدار ہوگا

(۲۷)

تماشا

حویلی کے بڑے دروازے پر آویزاں
دونوں کیمرے ہر روز
باہر کے مناظر دیکھتے رہتے ہیں حیرت سے
مگر اندر کی دنیا بھی
ہے کچھ باہر کے جیسی ہی
یہاں کے بسنے والوں میں
روابط بھی ہیں مستحکم
عداوت بھی مسلسل ہے
مکیں بالائی منزل کا
ہمیشہ دوسری منزل کے باشندے پہ
پہرہ تنگ رکھتا ہے
کسی بھی طور من مانی
نہ کرنے پائے یہ ہرگز
بنا اسکی اجازت کے
نہیں لے فیصلہ کوئی
مگر دوجے کو بھی ضد ہے

کریگا خودسری یونہی

--

فضا اس کی
گھٹن آلود بھی ہے، پرسکوں بھی
گھٹا اور دھوپ دونوں
آگے پیچھے چلتی رہتی ہیں
کوئی کنکر جو اس کی جھیل میں گر جائے
پہروں مضطرب رہتی ہیں لہریں
اٹھا کرتے ہیں جزر و مد بھی رہ رہ کر
ذرا جو گرم ہو موسم
یہاں پر بہنے والے سرخ پانی کا
بدلنے لگتا ہے تیور
کبھی بس بھاپ بن کر
جذب ہو جاتا ہے اندر ہی
کبھی طوفان کی صورت
سنامی کی طرح سب کچھ
مٹا دیتا ہے اک پل میں
درونِ خانہ سجتی رہتی ہے محفل
تماشا روز ہوتا ہے

(۲۸)

رنگیں کفن

ٹوٹے آئینے کی کرچیاں

جب خلش بن کے پیوست ہوں روح میں

خواب کے لالہ زاروں میں صرصر چلے

بجھ رہے ہوں امیدوں کے سارے دیئے

روح کے ریگزاروں کی تپتی ہوئی ریت میں

دفن ہو جاتی ہیں حسرتیں

اک سمندر سا آنکھوں میں بستا تو ہے

ابر بن کر برستا نہیں

بھاپ کی شکل میں،

گرم قطروں کی صورت ٹپکتا ہے اور

روح میں آبلے سے ابھر آتے ہیں

--

درد کی آنچ میں دھیمے دھیمے سلگتی ہوئی
زیست کے ہاتھوں لاچار کٹھ پتلیاں
اپنے پیروں میں چھالوں کی پازیب پہنے ہوئے
آرزوؤں کے خوں کی ردا اوڑھ کر
سانس کے ساز پر رقص کرنے کو مجبور ہیں
زندہ لاشیں پہنتی ہیں رنگیں کفن

(۲۹)

تغیّر

نور پھیلا تو ہے لیکن
کس قدر ہولناک ہے یہ سحر
روشنی چھین رہی ہے بینائی
گھونٹ ڈالا ہے دم بصیرت کا
اور تہذیب کے سینے میں
گڑے ہیں کرنوں کے خونی پنجے
رقص سفاکیت کا ہے ہر سو
گلیاں رہزن ہیں
راستے قاتل

--

یہ اجالا ہے؟ اس اجالے سے
لاکھ بہتر تھی رات کی ظلمت
سرمئی

نرم

ٹھنڈی

کاجل سی

اور کبھی روپہلی اوڑھنی اوڑھے

پرسکوں جھیل کی کی طرح خاموش

اسکی سیاہی میں جگمگاتا چاند

دہر میں امن کا پیامی تھا

اور ہواؤں کی سائیں سائیں بھی

پیار کی راگنی سناتی تھیں

--

دل لرزتے نہیں تھے سایوں سے

سخت تھے رات کے سبھی دستور

وہ اندھیرا سکوں کا ضامن تھا

یہ اجالا نقیب دہشت کا

(۳۰)

ضد

یہ کیسی ضد ہے!

ہر جذبے کو بس،

اظہار کے قالب میں ڈھالا جائے؟

کبھی آنکھوں کی تحریریں بھی

پڑھنے کی کریں کوشش

کبھی خاموشیوں میں پنہاں

پیغامات کو سمجھیں

ضروری تو نہیں!

ہر جذبے کو

الفاظ کے تابع رکھا جائے

--

(۳۱)

ادھورا

سالم ہے تن
من میں تھکن
دل کا چمن
ویران بن
خوابوں کا گھر
اجڑا نگر
مکھ پر خوشی
پہلو میں غم
لب پر ہنسی
اور آنکھ نم
--
سب تھا کبھی
اب کچھ نہیں
چٹخا گماں

ٹوٹا یقیں

خالی مکاں

ڈھونڈے مکیں

اپنے تو ہیں

اپنا نہیں

--

دیکھیں اگر

زندہ ہے وہ

سوچیں تو وہ

زندہ نہیں

(۳۲)

دیوتا

جانے کون تھی بیچاری
سدھ بدھ سے عاری
تکلیف سے بیکل
تڑپ رہی تھی
کرب کی حالت میں اپنے
جسم پہ جھولتے چیتھڑوں کو
چندی چندی کر ڈالا تھا
اور کبھی
سر کے
میلے بکھرے بالوں کو
اپنے گندے ناخن سے
زور زور سے نوچنے لگتی
درد کی شدت کے باعث
اس کی چیخیں
آسمان کو چھونے لگی تھیں

کوئی فرشتہ تھا شاید

جس نے مدد کی ہے اس کی

اسپتال پہنچایا بروقت

اگلے پل ہی

نرس نے جیسے

کان میں سیسہ انڈیل دیا ہو

''وہ بھی کوئی دیوتا ہوگا؟

جس نے اس پگلی کو

ایسا تحفہ دیا ہے''

(۳۳)

کاربن ڈائی آکسائیڈ:

جن سے امید پھول، پھل کی تھی
پیڑ کانٹوں بھرے وہ سب نکلے
جن کا سایہ ہی ایک دُھوکہ ہو
آکسیجن کسی کو کیا دیں گے
رات کی چھوڑیئے کہ یہ اشجار
دن میں بھی کاربَن اُگلتے ہیں

--

بڑھ رہا ہے فَضا میں زہر اتنا
سانس لینا بھی ہوگیا دُشوار
وقت کا بس یہی تقاضہ ہے
کچھ نئے پیڑ اب لگائے جائیں
جِن کی شاخُوں میں اتنی وسعت ہو
سب کو یکساں دیں، پھُول، پھَل، سایہ
دَم گھُٹے نہ کسی بھی پنچھی کا
گُلستاں میں نئی بہار آئے

(۳۴)

تدبیر

ہتھیلی پر بنی
چھوٹی، بڑی
ترچھی، کٹی
سیدھی لکیریں
جن میں ان دیکھا مقدر ڈھونڈتے
یہ بھولے بھالے لوگ
شکستہ خوابوں اور محرومیوں کی
بھاری گٹھری پیٹھ پر لادے
عمل سے توڑ کر ناطہ
وجود اپنا لپیٹے کاہلی کی میلی چادر میں
نجومی، جیوتشی سے
اپنی قسمت پوچھنے والے
کب اس پر غور کرتے ہیں

کہ قدرت نے

ہتھیلی کے ہے آگے انگلیاں رکھیں؟

--

ہتھیلی صرف تختی ہے

مگر یہ انگلیاں ساری

قلم بھی ہیں، برش بھی

رنگ بھی اور روشنائی بھی

یہ جب حرکت میں آتی ہیں

تو اس تختی پہ کندہ لائینوں کو

خوبصورت روپ ملتا ہے

لکیریں جگمگاتی ہیں

مقدر جاگ اٹھتا ہے

(۳۵)

نمک

جانے کتنی صدیوں سے
بہ رہا ہے نسلوں کی
جو رگوں میں خوں بن کر
وہ نمک نہیں بلکہ
قرض ہے بزرگوں کا
ایک چٹکی ہی سہی
پر بہت ہی بھاری ہے
--
چھوٹے ظرف والوں کو
اس کا مول کیا معلوم
وہ تو پل میں آن اس کی
خاک میں ملاتے ہیں
--
اس کا پاس رکھنے میں
اس کی لاج ڈھونے میں
خاندانی لوگوں کی
عمریں بیت جاتی ہیں

(۳۶)

انداز

طلسمی لہجے کی اوڑھنی میں
حسین لفظوں کے پھول ٹانکیں
یا اپنے اندر کی تلخیوں پر
تبسموں کا نقاب اڑھا دیں
مگر دلی کیفیت پہ پردا
نہ ڈال پائیں گی یہ کبھی بھی
کہ آپ کا بدلا بدلا انداز
راز سب فاش کر ہی دے گا

(۳۷)

شہزادہ

جانے کیوں مائیں اکثر
ایسے خواب سنجوتی ہیں
دور دیس سے راجکمار
اس کو لینے آئے گا
یا پریوں کی نگری سے
اترے گا شہزادہ کوئی
پیار سے تھام کے ہاتھوں کو
خوشیوں کے ہنڈولے پر
چاند نگر لے جائے گا

--

اندر دھنش کے رنگ وہ سارے
جیتی جاگتی گڑیا کی
معصوم سی ننھی آنکھوں میں
بنا یہ سوچے بھر دیتی ہیں

خواب کی مالا ٹوٹی تو
سارے موتی بکھریں گے
رنگ نمک کے پانی سنگ
بہے گا جب، تب کیا ہوگا؟

--

خبر نہیں ہے ان کو شاید
یا دیتی ہیں خود کو دھوکا
شہزادوں کی دنیا میں
گڑیوں کا کوئی مول نہیں
ان کی نظر میں ہر گڑیا
کٹھ پتلی کے جیسی ہی ہے
ڈور وہ جیسے چاہیں کھینچیں
ڈھیل دیں یا کسیں شکنجہ
دائیں بائیں جدھر گھمائیں
گھومتی رہنا ہے بس اس کو
"اف" کرنے کی نہیں اجازت
"چوں" کرنے کی سزا کڑی ہے

--

(۳۸)

احتجاج

مجھے بزدل کا تحفہ مت بناؤ!
نہیں ہوں بزدلی کی میں علامت
کبھی دیکھا نہیں کیا غور سے؟
مجھے جن ہاتھوں نے بھی
توڑنے کی کوششیں کیں
خراشیں ڈال دی ہیں میں نے ان پر

(۳۹)

جھروکا

اُس کے ہمسایوں نے جب سے
اپنی اپنی کھڑکیوں پر
کالی فلمیں چسپاں کی ہیں
دائیں جانب کے مکینوں نے
دیواریں اونچی کرلی ہیں
اور بائیں سمت والوں نے
بہت موٹی سی چق
دروازے پر ڈال دی ہے
--
تبھی سے جانے کیوں
مٹی کا وہ پُتلا
بڑا اداس
بہت مضطرب سا رہتا ہے
اور اس کی گول گول آنکھیں
ہمیشہ جو ہر اک کی ٹوہ میں

چاروں طرف پھرتی ہی رہتی تھیں
وہ ساکت ہو گئ ہیں اب

--

مگر اندر کی بے چینی
نگاہوں سے ہویدا ہے
تجسس اور سُن گُن لینے کی فطرت
سکوں سے بیٹھنے دیتی ہی کب ہے
کسی روزن، کسی شگاف کی تلاش میں
پھرا کرتی ہے وہ بیکل
کہیں سے راز کوئی تو ملے اس کو
جسے وہ مشتہر کر کے
تماشا سب کو دکھلائے

--

مگر مٹی کے اس پتلے کو
شاید یہ نہیں معلوم
کہ جھانکنے کے واسطے
اپنے گریباں سے مناسب
جھروکا دوسرا کوئی نہیں

(۴۰)

عورت

بڑھاتی ہوں قدم

فوراً ہی پیچھے کھینچ لیتی ہوں

یہ اندیشہ مجھے آگے کبھی بڑھنے نہیں دیتا

نہ جانے لوگ کیا سوچیں؟ نہ جانے لوگ کیا بولیں؟

اسی اک خوف کے گھیرے میں جیتی اور مرتی ہوں

مگر کب تک؟

تشخص کے لیے اپنی ضروری ہو گیا ہے اب

اٹھوں، اور کاٹ دوں ایک ایک کر کے بیڑیاں ساری

بغاوت کر دوں دنیا کی

سبھی فرسودہ رسموں سے

ہر اک دستورِ بیجا سے

خدا نے جب کسی سے میرا رتبہ کم نہیں رکھا

تو کس نے حق دیا ان کو؟

مجھے زنجیر پہنائیں؟

زباں کھولوں جو اپنے واسطے، تالا لگا جائیں؟

--

مجھے معلوم ہے میری مقرر حد کہاں تک ہے

مجھے ہے پاس اپنی حرمت وقدر وروایت کا

وفا، ناموس وعفت کا، شرافت اور عظمت کا

کہ یہ اقدار میرے پاؤں کی بیڑی نہیں ہرگز

انھیں اقدار کے ہمراہ مجھ کو آگے بڑھنا ہے

ملا ہے حق مجھے بھی

وقت کے ہمراہ چلنے کا

خود اپنے خواب بننے کا

انھیں تعبیر دینے کا

یہ دنیا میرے ہاتھوں سے قلم جو چھین لیتی ہے

ہمیشہ چولھے چوکے تک ہی بس محدود رکھتی ہے

اسے شاید یہی خدشہ ستاتا رہتا ہے ہر دم

مری یہ آگہی مجھ کو نئی پہچان دے دیگی

(۴۱)

عزتِ نفس

اس کے آس پاس بھیڑ جمع تھی
شاید کوئی عظیم شخصیت ہو؟
مگر نہیں!
وہ جو بھی تھا،
بڑی چیز ضرور لگ رہا تھا
اس کے کپڑوں سے کہیں زیادہ
اس کی گردن کلف دار تھی

--

لوگوں کے سوالوں کے جواب میں
ست رنگی مسکراہٹ کا گولا
ان کی جانب اچھال دیتا
جس میں
طنز، تحقیر، تکبر، تمسخر جیسے

دھاگوں کے بیچ

ہر سوال الجھ کر رہ جاتا ہے

--

اچھا ہی ہوا

میں نے کوئی سوال نہیں کیا

ورنہ میرے ہاتھ میں بھی

ایسا ہی اک گولا ہوتا

شکر ہے

عزتِ نفس مجروح ہونے سے بچ گئی

(۴۲)

انسان

مٹی کا پتلا
شیشے کا دل
خواہشات کا سمندر
جذبات کا طوفان
طرب کا نغمہ
کرب کا گیت
الفت کا پھول
نفرت کا شول
خیر و شر کا آئنہ
فطرت کا عکس
زندگی کے موسموں کی
مار جھیلتا شجر
انسان

(۴۳)

گمشدہ

وہی مکاں ہے

وہی بام و در

وہی محراب

صحن میں نیم کا پرانا شجر

اسی طرح سے ہے قائم مگر

تھکی تھکی سی یہ شاخیں

تلاش کرتی ہیں اسی لاابالی بچپن کو

جو اسکے چھاؤں میں ادھم مچایا کرتا تھا

اسی کے نیچے گھروندے بنائے جاتے تھے

اسی پہ جھولے کی پینگیں بڑھائی جاتی تھیں

اسی کے سائے میں ہوتی تھیں بحث و تکراریں

مگر وہ خفگی تھی پانی کے بلبلے جیسی

جہاں نہ بغض و حسد تھے

نہ بھید بھاؤ کوئی

بس ایک رشتہ تھا دانت کاٹی روٹی کا

--

آج بھی سجتی ہے یہاں محفل

قہقہے اب بھی گونجتے ہیں یہاں

کھلکھلاتا اسی طرح سے ہے بچپن

پر وہ پہلے سی کوئی بات نہیں

شاخ جھولے کے واسطے ہے اداس

اور گھروندا نہیں بناتا کوئی

اب بھی آباد ہے مکاں لیکن

کتنا کچھ گمشدہ سا لگتا ہے

(۴۴)

قلم زد

دلنشیں خوابوں کی رنگیں تصویر
ان کہے جذبوں کی دلکش تحریر
اور احساس کو موصول ہوئے مخطوطے
دل کی دیوار پہ آویزاں ہیں طغرے کی طرح
خوشنما پل، غمزدہ لمحے
سوز کے گیت طرب کے نغمے
ذہن کے شیلف میں محفوظ ہیں سارے نسخے
دشتِ تنہائی کے ظلمات میں،
یادوں کے دریچوں سے وہ سارے ہی نقوش
جگمگاتے ہیں ضیا بار لکیروں کی طرح
وقت کے بس میں نہیں ان کو قلم زد کرنا

(۴۵)

انتباہ

تعریفوں کے بوکے میں

پھول کچھ اضافی ہیں

گفتگو میں خوشبو بھی

تیز تر ہے پہلے سے

دلنشیں تبسّم کا

زاویہ بھی گہرا ہے

دل یقیں کی وادی میں

پاؤں رکھنے والا تھا

دفعتاً چھٹی حس نے

آنکھ کھول دی اپنی

ان حسیں لفافوں میں

چھل چھپا نہ ہو کوئی؟

دوستانہ لہجے میں

رس بہت زیادہ ہے

(۴۶)

رہگزر

تو جسے
منزل سمجھ بیٹھا ہے
وہ منزل نہیں
پایۂ تکمیل ہے
یہ نہیں ہے اختتام
جستجو در جستجو ہے
اور سفر اندر سفر
رہگزر کے بعد بھی ہے
رہگزر ہی رہگزر

(۴۷)

اَدھر

آندھیاں

طوفان

بجلی

زلزلہ

سب کے سب آفتِ ناگہانی ہیں

جب بھی آئے

کر گئے سب تہ و بالا

آر یا پار

موت جیتی

یا زندگی ابھری

--

مگر!

دوستی

دشمنی

رشتے ناطے

لحاظ، مروت، پاسداری

روایت، جدت، دنیاداری

یقین وگمان

امید وبیم

امرت بھی، زہر بھی

نہ آر، نہ پار

نہ جینے دیں، نہ مرنے دیں

کبھی گلاب، کبھی عذاب

(۴۸)

پیاس

خاک چھانی ہے کتنے ہی صحراؤں کی
وادیوں، جنگلوں میں بھٹکتے پھرے
شہر کی رونقوں میں بھی ڈھونڈا کئے
گاؤں کی سادگی میں بھی کھوجا اسے
ایک اک کر کے دھرتی کی ساری تہیں دیکھ لیں
آسمانوں کے اوراق پر
حرفِ مہتاب اور کہکشاں کو پڑھا
جھانک آئے ہیں کنوؤں کی گہرائیاں
جھیل، تالاب، دریا سے ہوتے ہوئے
ہم سمندر کی تہ تک چلے آئے ہیں
لیکے ہاتھوں میں موتی، جو ابھرے، لگا
پیاس کچھ اور بھی ہوگئی ہے سوا

--

(۴۹)

رسہ کشی

سطح چہرے کی شانت ہے لیکن
آئینہ زلزلے کی زد میں ہے
موج میں اضطراب برپا ہے
ایک ہلچل سی تہ میں ہے جاری
پارہ پارہ ہوئے ہیں لفظ سبھی
ریزہ ریزہ بکھر گئے جذبے
ضبط اور اشک کی لڑائی میں
کتنا کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے

--

(۵۰)

انصاف

(ایک ریمارک کے جواب میں)

جنابِ والا!
یہ آپ نے کیسی بات کہ دی؟
کہ ابنِ آدم کی لغزشوں کے لیے سدا سے
ہے کوئی مجرم؟ تو حسن ہی ہے
نجانے کتنوں کو ورغلایا
گنہ کی جانب کیا ہے راغب
اسی کے کارن یہ ابنِ آدم
بہک رہا ہے، بھٹک رہا ہے

--

یہ کیسا یک طرفہ فیصلہ ہے؟
جو سارے جرم
ایک ہی کے کھاتے میں لکھ دیئے ہیں؟

حضور! جاں کی اماں جو پائیں؟
تو ہم بھی اپنی زبان کھولیں؟

--

اگر یہ سچ ہے؟
ہمیں بتائیں؟
کہ ننھی زینب نے دلربائی کے
جلوے اپنے کہاں بکھیرے؟
وہ اسّی سالہ ضعیفہ جس کا
شباب کب کا گزر چکا ہے
ادائیں اس نے دکھائیں کیسی؟
کیوں ساتھ ان کے ہوئی ہے آخر؟
یہ وحشیانہ ذلیل حرکت؟
گھروں میں لٹتی ہیں عصمتیں جو
کچھ ان کے بارے میں بھی تو بولیں؟
جو قحبہ خانوں میں جسم بکتے ہیں
ان کے گاہک ہیں کون آخر؟

--

بھری ہو ذہنوں میں جب غلاظت

تو کوئی دیوار، کوئی پردا

ہو کوئی برقع یا کوئی گھونگھٹ

نہ کر سکیں گے کبھی حفاظت

چھنے گی مریم کے سر سے چادر

لٹے گی سیتا کی یونہی عصمت

جو فیصلہ ہو تو منصفانہ

ہو حسن پر احتیاط لازم

نظر کو بھی حد میں رہنا ہوگا

(۵۱)

سلو پوائزن

شک کے انکر سے پھوٹے
خواہ مخواہ کے مفروضے
یقیں کے جسم میں
سلو پوائزن کی مانند
دھیرے دھیرے گھلتے ہیں
اور جذبات کے گرد
آکٹوپس کی طرح
کستے ہیں اپنا شکنجہ

--

گھٹنے لگتی ہیں
تعلقات کی سانسیں
دھیمی ہو جاتی ہے
نبض محبت کی

اور دوراہے پر ٹھہرے
متذبذب رشتوں کے
آگے کنواں ہوتا ہے
پیچھے کھائی

--

موت سے بچے بھی تو
خبر نہیں!
کتنا عرصہ کوما میں رہنا ہوگا
یہاں اکثر
وقت کی مسیحائی بھی
کارگر نہیں ہوتی

--

(۵۲)

پس منظر

تم نئے مسافر ہو
تم کو کیا خبر اس کی
یہ حسیں مناظر سب
اک طلسمی دھوکا ہیں
منظروں کے پس منظر
ہیں برعکس تصویریں

--

ہر ایک شاخ سہمی ہے
سارے برگ لرزاں ہیں
گل کے ہونٹ زخمی ہیں
باغباں کی آنکھیں نم

(۵۴)

اماوس کا سایہ

لمحے پانی کی طرح ہاتھ سے بہتے رہے
اور دبے پاؤں گزرتے گئے دن، ماہ، برس
آج تک مل نہ سکی خواب کی تعبیر اسے
کان ترسا کیے کلکاریاں سننے کے لئے

--

تھک گئی ہے وہ اب اپنا ہی لاشہ ڈھوتے
ثبت ہے آج بھی احساس میں نظروں کی چبھن
اور سماعت کے سبھی ذخم
ہرے ہیں اب تک
مہرباں اب بھی اس کے دامن میں
ڈال جاتے ہیں طنز کے فقرے

--

روز امید کی موت ہوتی ہے

روز اک درد جواں ہوتا ہے

روز اک زخم نیا ملتا ہے

چاند خوش بختوں کے آنچل میں اترتا ہے،

اور وہ!

بدنصیب ایسی ہے گود میں جس کی

اماوس کے سوا کچھ بھی نہیں

--

(۵۴)

پردا

تبسم، تکلم کے دھاگوں سے بُن کر

بنایا تھا اک خوبصورت سا پردہ

ہر اک درد کا جس نے ڈھانپا تھا چہرہ

مگر جھوٹ سے

کب نبھاتی ہیں آنکھیں

ذرا ٹھیس پہنچی

برسنے لگیں

یہ آنکھیں بالآخر مکر ہی گئیں

--

(۵۵)

چاک کی مٹی

بڑی حسرت سے بولی
کوزہ گر سے چاک کی مٹی
تو اپنی کوششوں سے
لاکھ سندر روپ دے مجھ کو
مگر ہستی کا میری ہے
فقط اتنا سا افسانہ
سنورنا، ٹوٹ جانا
چور ہونا اور بکھر جانا

(۵۶)

اسیر

کنواں کسی کا مقدر نہیں ہوتا

ہم آپ ہی ہو جاتے ہیں اسیر اس میں

ہمیشہ پانی کے تیور سے خوف کھاتے ہیں

مطابق اسکے سدا خود کو ڈھالتے ہی رہے

کبھی کوشش نہ کی اس سے مگر نکلنے کی

بس ایک جست کی دوری پہ ہے منڈیر مگر

وہ ایک جست اگر وقت پر لگا نہ سکے

تمام عمر کوئیں میں ہی گھٹتے رہنا ہے

(۵۷)

الہام

نظر اٹھی ہے کبھی جو
کسی کی خامی پر
انا کے بیج سے
پھوٹا ہے میں کا انگر جب
اور اس سے پہلے
کہ وہ سر نکالتا اپنا
ہوا ہے دل کو یہ الہام
جھانک اپنے اندر بھی
پھر اس کے بعد
جہاں میں کوئی برا نہ لگا

(۵۸)

بھٹکاؤ

جب سارا عالم سوتا ہے

اور چاند اکیلا ہوتا ہے

چاندنی فرش پہ دھرتی کے

اپنا نور بچھاتی ہے

پھول کے کاسے میں شبنم

اپنے موتی لٹاتی ہے

موجِ صبا اٹھلاتی ہوئی

پیغامِ محبت لاتی ہے

رات کی رانی کا جادو

ماحول پہ چھانے لگتا

اور بھینی بھینی خوشبوئیں

جذبات جگانے لگتی ہیں

--

تب آنکھوں کے پٹ مل جاتے ہیں
تخئیل کے در کھل جاتے ہیں
اور من کا پنچھی
توڑ کے پنجرہ
خواب نگر اُڑ جاتا ہے

(۵۹)

شام کا بھولا

بھول بھلیاں گلیاں ساری
دور تلک ہے گھنا اندھیرا
شفق، دھندلکا، دیپک، سب ہی
سو گئے اوڑھ کے کالی چادر
آس کی گٹھری کو پلکوں نے
نینوں سے باہر پھینک دیا ہے
سوکھی جھیل میں کوئی بھی
عکس اترنا ناممکن ہے
لاکھ جتن وہ کر لے، لیکن
شام کے بھولے راہی کو
ہر دروازہ بند ملے گا

(٦٠)

برف

مہر لب پر

آنکھ ساکت

جذبے جامد

جسم شل

ہے ضرورت وقت کی

تیشہ بدست آئے کوئی

شعلہ نوا اٹھے کوئی

اک ضرب سوئے ذہن پر

اور آنچ دے احساس کو

برف تب پگھلے گی یہ

(٦١)

سراب

وہ نرم جذبہ سحاب جیسا
حسیں شگفتہ گلاب جیسا
لگے ہے صحرا میں آب جیسا
--
جو خلوتوں میں کرے تکلم
لبوں کو بخشے حسیں تبسم
نظر میں اترے مثالِ انجم
--
نہاں ہے بیشک نفس نفس میں
ملا ہے کس کو ہے کس کے بس میں
رہا کبھی بھی نہ دسترس میں
--
وہ خواب ہی تھا وہ خواب ہی ہے
حجاب آخر حجاب ہی ہے
مجازی جذبہ سراب ہی ہے

(۶۲)

موسم

معلوم ہے یہ کس کو
کب عہدِ بہار آئے
کب دورِ خزاں ٹھہرے
کس وقت گھٹا برسے
بس دل کے سمندر سے
سب اس کا کنکشن ہے
آنکھوں کا یہ موسم بھی
ہے کتنا عجب موسم
بے وقت مچل جائے
رنگ اپنا بدل جائے
فرقت میں سلگ اٹھے
قربت میں برس جائے

(۶۳)

خوف

ظلمتیں تو چھٹ گئیں
خوف کا عفریت اب بھی
رقص پرور ہے یہاں
پھول، غنچے، برگ، کلیاں
سہمے سہمے ہیں سبھی
کون جانے، کب کہاں، کس موڑ پر
کوئی رہزن انکی عصمت لوٹ لے
بے سبب انکو مسل دے
ننھے غنچوں کے لہو سے
لال کر دے یہ زمیں

(۶۴)

سورۃ المرسلٰت کا پیغام

(۱)

صبح دم ہولے سے
چلتی ہوئی بادِ صبا
گرم، جلتی ہوئی بادِ صرصر
اور جو لاتی ہے بارش کی نوید
ابر پھیلاتی ہے
پھر ایک ہی جھونکے سے
اڑا دیتی ہے بادل سارے
دیکھ کر فرق حق و باطل کا
پھر بھی ایمان نہیں لاتے ہیں
جانتے ہیں حکم رب کا ہے اٹل
جو مقدر کر دیا
وہ کبھی ٹلتا نہیں
ایک دن مٹ جائے گی یہ کائنات

آسماں پھٹ جائے گا

اور ستاروں کی ضیا بجھ جائے گی

روئی کے گالے کی مانند

منتشر ہو جائیں گے کوہِ گراں

فیصلہ اس دن سنایا جائیگا

اور وہ دن؟

کاذبوں کے واسطے حسرت کا ہوگا

(۲)

پہلے گزرے لوگوں کے انجام سے واقف نہیں؟

جس طرح ان پر ہلاکت آئی تھی

ویسی ہی ان پر بھی آئے گی ضرور

رب کا ہے دستور اٹل

کاذبوں کے واسطے ذلت و خواری ہے بس

(۳)

اس حقیقت سے نہیں آگاہ کیا؟

پانی کی بے حیثیت سی بوند سے

رحم میں ٹھہرایا اور

پیکرِ انسانی میں ڈھالا انھیں

پھر بھی اس تخلیقِ لاثانی کے وہ قائل نہیں

کہتے پھرتے ہیں یہی

آپ ہی پیدا ہوئے

آپ ہی مر جائیں گے

جھوٹ جو بولے!

خرابی سر بسر اس کی ہی ہے

(۴)

کیا نہیں معلوم؟

مٹی کی زمیں یہ

زندہ اور مردوں کی خاطر

عارضی مسکن ہے بس!

کوکھ سے اس کی اگائے

کس نے میووں کے شجر؟

میٹھے پانی سے

بجھائی کس نے ان کی تشنگی؟

پھر بھی سب کچھ جان کر

انجان وہ بنتے رہے

کذب گو یارا

ہلاکت ہی ہلاکت بالیقیں

(۵)

زندگی بھر جس کو جھٹلاتے رہے

ہاں! وہی گہری، سیاہ

دہکی ہوئی پُرہول دوزخ

ہوگی ان کے روبرو

پھر اسی دھوئیں کی شاخوں کی طرف

چلنا ہے بس

جو ذریعہ ہیں عذابِ سخت کا

جس کے انگاروں کا جحم

قصرِ شاہی سے وسیع

جس کے شعلوں کی لپٹ

زرد اونٹوں کی طرح

گھیر لے گی ہر طرف سے جو اُنھیں

جاگتی آنکھوں سے اپنی دیکھیں گے

جھوٹ کا انجامِ بد

(۶)

سلب کر لی جائے گی گویائی اور

ہر عضو کو بخشی جائے گی زباں

جو گواہی دیں گے خود ان کے خلاف

جھوٹ کا انجام بربادی ہے بس

(۷)

ہر نفس

وحشت زدہ

پُرخوف اور سہما ہوا

منتظر ہے نامۂ اعمال کا

آ گیا محشر کا دن

اب کوئی حیلہ نہ ہوگا کارگر

کام آئے گا نہیں کوئی دروغ

ذلت و رسوائی سے

اب نہیں ان کو مفر

کاذبوں کے واسطے

بس عذابِ سخت ہے

(۸)

راستی پر چلنے والے

ہوں گے اس دن کامیاب

ٹھنڈے چشمے

نعمتوں کی چھاؤں

من بھاتے پھلوں کے درمیاں

جنت الفردوس میں آرام سے

تاابد رہنا ہے اب

نیکیوں کی یوں جزا دیتے ہیں ہم

کاذبوں کے واسطے

ہاتھ ملنے کے سوا

اور کوئی چارہ نہیں

(۹)

چاندنی یہ عیش وعشرت کی

فقط کچھ روز ہے

پھر اماوس کا اندھیرا چھائے گا

سرکشی سے باز اگر آئے نہیں

یاد رکھیں اس گھڑی

کوئی نہیں کام آئے گا

جھوٹ کا انجام عبرتناک ہے

(۱۰)

عمر بھر نظریں حقیقت سے

چُراتے ہی رہے

سچ عیاں تھا

روز روشن کی طرح

پھر بھی دانستہ کیا

اس سے گریز

اب حقائق سے کریں گے

چشم پوشی کس طرح؟

تاابد اپنے کئے کی

بس بھگتنا ہے سزا

جھوٹ کا انجام دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں

(۶۵)

منتقل

کیا ہے دنیا بھلا؟

اک سرائے ہے بس!

جس میں انسان کچھ دن کا مہمان ہے

اس کے گلشن سے سکھ دکھ کی کلیاں لیے

اپنے اعمال کا بوجھ ڈھوتے ہوئے

سعی پیہم،
مسلسل تھکن سے پرے

اوڑھ کر خامشی کی ردا ایک دن

دارِ فانی سے ہو جائے منتقل

(٦٦)

تو دعا بن کے ساتھ ہے میرے

(والدہ کی برسی پر)

سارا منظر بدل گیا لیکن
دل کسی طور مانتا ہی نہیں
دھندلی دھندلی سی ہے فضا ساری
ذہن بوجھل ہے اور دل بھاری
آج بھی ہوتا ہے یہی محسوس
جیسے تو آس پاس ہو میرے
دیکھنے والوں کو سدا مجھ میں
عکس تیرا دکھائی دیتا ہے
تیری تعلیم و تربیت کی چمک
میرے کردار میں جھلکتی ہے
تو دعا بن کے ساتھ ہے میرے
ہر گھڑی دل کے پاس ہے میرے
اک نظر تجھ کو دیکھنے کے لیے
پھر بھی آنکھیں سدا ترستی ہیں

--

جانتی ہوں کہ یہ نہیں ممکن
جانے والے کبھی نہیں آتے
اب کہاں تجھ کو دیکھ پاؤں گی
اب تو خوابوں ہی میں ملیں گے ہم
سوز جھلکے گا ہر مسرت سے
زیست بے ساز ہی رہے گی اب
عمر بھر تیرے بوسے کی خاطر
میری پیشانی یونہی ترسے گی
ذکر تیرا چھڑے گا جب جب بھی
آنکھ بے اختیار چھلکے گی
ہاتھ اٹھتے ہیں میرے بہرِ دعا
جس طرح تو نے عہد طفلی میں
مجھ کو اپنی امان میں رکھا
بس اسی طرح سے خدا تجھ کو
اپنی رحمت کے سائے میں رکھے
تیری تربت کو نور سے بھر دے

مختصر نظمیں

(۱)

آگ

منظر ہے راکھ راکھ
پس منظر دھواں دھواں
آگ اندر ہو یا باہر
خاک کر دیتی ہے سب

(۲)

غلط فہمی

بات کہنے کا سلیقہ
اور سمجھنے کا شعور
گر نہ ہو حاصل
تو لیتی ہے غلط فہمی جنم

(۳)

صفت

سارے جنگل میں ماتم ہے پسرا ہوا
ہر درندے کی آنکھیں ہیں اشکوں سے تر
میں نے پوچھا، ''ہوا کیا ہے؟ کچھ تو کہو!
غم ہے کس بات کا، یہ اداسی ہے کیوں؟''
بولے، ''روئیں نہیں ہم، تو پھر کیا کریں !
آدمی نے ہماری صفت چھین لی''

(۴)

فریب

آرزو، امید
خوابوں کے طلسمی جال سے
کب نکل پایا کوئی
زندگی سے بڑھ کے ہیں
زندگی کے یہ فریب

(۵)

بارہا

جب لگا
دسترس میں ہے سب کچھ
عین اسی وقت خواب ٹوٹا ہے

(٦)

سائرن

کوچ کے حکم نامے پہ بس
مہر لگنے ہی کی دیر ہے
اپنا ساماں سنجوئے رہیں
جانے کب سائرن بج اٹھے

(۷)

انجان

بسا اوقات اک خاموشی

کتنی ہی بلائیں ٹال دیتی ہے

کئی فتنے دبا دیتا ہے اکثر

سبھی کچھ جان کر انجان بن جانا

(۸)

تضاد

ایک جیسی ہی خطا دونوں سے ہوتی ہے مگر

اپنے لیے ڈھیروں دلائل ہیں ہمارے پاس اور

دوسرے کے واسطے صادر کیا بس فیصلہ

(۹)

گواہی

مناظر کی گواہی سے

کیوں آنکھیں موندتے ہو اب؟

یاد کرو!

یہ سارے چیختے مجسمے

تم نے ہی تراشے ہیں

(۱۰)

رومان

رومان کی وہ دنیائے حسیں

ہر ایک گماں لگتا ہے یقیں

تب ایک ہی خواہش ہوتی ہے

یا نیند نہیں ٹوٹے یارب

یا خواب حقیقت ہو جائے

(۱۱)

خواب

حقیقتیں اٹل سہی

مگر یہ بات بھی سچ ہے

جو ہستی میں

نئے کچھ رنگ بھرنے ہوں

نئی تعبیر لکھنی ہو

تو کوئی خواب بھی دیکھو

(۱۲)

خراشیں

زخم کیسا ہی ہو

بھر جاتا ہے دھیرے دھیرے

پھر سبب کیا ہے

کیوں مٹتیں نہیں ہیں آخر

یہ جو پھولوں کے تبسم سے خراشیں آئیں

تریویناں

(سہ حرفیاں)

اضطراب

اس کی نیند اڑائی اور
خود بھی جاگ کے کاٹی رات
دشمن سوئے نہ سونے دے

بربط

درد کا ساز ہو یا تار ہو بربط کا
آپ سے آپ نہیں بجتا کبھی
چوٹ لگتی ہے تو چیخ نکل آتی ہے

دغا

آنکھوں میں جاگی ہے چبھن
رینگ رہی بستر کی شکن
نیند نے پھر سے دے دی دغا

کمہار کی مٹی

اپنی مرضی کے برخلاف بھی یہ
کوئی سانچہ ہو، ڈھل ہی جاتی ہیں
لڑکیاں ہیں کمہار کی مٹی

جذبات

کتنے احساس کے تاروں کو ملی ہے سرگم
کتنے مبہم سے اشاروں نے زباں پائی ہے
جب بھی جذبات نے جذبات سے باتیں کی ہیں

نقرئی گھنٹیاں

تارِ احساس میں ہو لرزش جب

چاپ مانوس سی لگے کوئی

''نقرئی گھنٹیاں سی بجتی ہیں''*

*****

حوصلوں کو اڑان مل جائے

اپنی پرواز پر یقیں آئے

''نقرئی گھنٹیاں سی بجتی ہیں''*

(*اختر الایمان)

پہچان

کرم فرماؤں کے ایسے بھی ہوتے ہیں کرم اکثر

وہ خود ہی زخم دیتے ہیں وہ خود مرہم لگاتے ہیں

''کسی کو ایک ہی پہچان دے پانا بھی مشکل ہے''

بھرم

ظاہر ہے اس پہ وہ اور اُس پر عیاں ہے یہ
دونوں ہیں ایک دوجے کا پردہ رکھے ہوئے
یہ بھی سفید پوش ہے، وہ بھی سفید پوش

ہوائی تیر

بالکل سچے لگتے ہیں
کس خوبی سے گڑھتے ہیں
بے پر کے افسانے لوگ

چادر

چیتھڑوں سے ڈھکے نیم عریاں بدن
کتنی لاشیں یہاں رہ گئیں بے کفن
اور مزاروں پہ چادر چڑھاتے رہے

ماہیے

امید کی شمعیں ہیں
دیوار پہ کاگا
دہلیز پہ آنکھیں ہیں

منظر کی گواہی ہے
روئیں نہ کیوں آنکھیں
ہر سمت تباہی ہے

کھلتا مرجھاتا ہے
سینے میں سبھی کے
اک پھول سا بچہ ہے

ہر سمت اندھیرے ہیں
بھور کے پیغمبر
سورج کے لٹیرے ہیں

یہ جبر کا بندھن ہے
کیسے کلی مسکائے
پت جھڑ کی دلہن ہے

سپنے کی شرارت ہے
بیر بہوٹی سی
چہرے کی رنگت ہے

کیا چھوٹی کیا موٹی
آدم کی نسلیں
ایک توے کی روٹی

جڑتے نہیں سب موتی
ہر ٹوٹے رشتے کی
تجدید نہیں ہوتی

دوہے

(۱)

الجھے دھاگے کی طرح، ہے جیون کی ڈور
عمریں بیتیں کھوجتے، ملے نہ اسکا چھور

(۲)

گاؤں ہو یا شہر ہو، سبکی اک روداد
جانے کب کس موڑ پر، نازل ہو افتاد

(۳)

مٹھی سے نادان کے، پھسل رہی ہے دھوپ
ہاتھوں کی ریکھاؤں میں، کھوجے کل کا روپ

(۴)

رنگ بدلتا ہے سدا، وقت یونہی چپ چاپ
بھرے گھڑا جب پاپ کا، پھوٹت اپنے آپ

(۵)

پانی ہے منزل اگر، بیٹھ نہ یوں چپ چاپ
پانی کے جیسے بنا، اپنا رستہ آپ

(۶)

سانپ ڈسے اس کی دوا، ہوجاتی ہے آج
مانس جس کو کاٹ لے، اس کا نہیں علاج

(۷)

دھیرے دھیرے ہو گیے، عکس سبھی معدوم
بدل دیا ہے وقت نے، لفظوں کا مفہوم

(۸)

رات کو سمجھے بھور ہے، دن کو سمجھے شام
سوچ پہ کس کا بس چلا، من پر کہاں لگام

(۹)

بھاگ بھروسے کب بھلا، بدلے ہیں حالات
جیسی بھاری صبح تھی ، ویسی بوجھل رات

(۱۰)

فرقت کی رت ایک سی دھوپ کہ ہو برسات
صحرا جیسا دن لگے جنگل جیسی رات

(۱۱)

ململ جیسی چاندنی، مخمل سے جذبات
قربت کے لمحات کی، صندل جیسی رات

(۱۲)

دن کی جھولی سے ملی، زخموں کی سوغات
آنسو پونچھے پیار سے، آنچل جیسی رات

(۱۳)

نیکی میں گزرے اگر، روشن کرے حیات
اور گناہوں کی سدا، دَلدَل جیسی رات

(۱۴)

نکتہ چیں کچھ ہوش کر، شعر ہے نازک بات
خنجر سے مت کاٹ تُو، ریشم سے جذبات

(۱۵)

کچھ قسمت کا کھیل تھا، کچھ اپنوں کی گھات
ورنہ آساں تھا نہیں، ہم کو دینا مات

(۱۶)

ہولے ہولے کان میں، کیا کہ گئ بیار
دھیرے دھیرے کھُل رہے، کلیوں کے اسرار

(۱۷)

جھکتی پلکوں میں حیا، اٹھتی میں اقرار
اُن آنکھوں میں پریم کا، بستا ہے سنسار

(۱۸)

کومل سُور کی گونج سے، پھوٹے رس کی دھار
ہونٹوں کی مسکان سے، جھڑتے پھول ہزار

(۱۹)

جلیں پلک کی اوٹ میں، دو نینن کے دیپ
جیسے ساگر کے تلے، دو موتی دو سیپ

(۲۰)

ڈلک سنہرے روپ کی، سورج کو کجلائے
نرمل چھایا دیکھ کر، درپن بھی دھندلائے

(۲۱)

مکھڑے کی یہ روشنی، جیسے پاک خیال
دیکھ خرامِ ناز کو، ہرنی بھولے چال

(۲۲)

روپ سے اس کے دھوپ نے، لیا بسنتی بھیس
ہوئیں گھٹائیں باؤلی، بکھرے کالے کیس

(۲۳)

سرسوں پھولی کھیت میں، جاگی من میں پریت
دھڑکن کے ہر تار نے، چھیڑا ہے سنگیت

(۲۴)

یونہی تو ملتی نہیں، جذبوں کو تاثیر
سچے ہوں گے رنگ جو، بولے گی تصویر

(۲۵)

ایسی کیا دریا دلی، بات نہیں یہ ٹھیک
اپنے نین گنوائے کے، در در مانگے بھیک

گیت

گیت

اے چاند بتا تو کس کو کھوجے!
کون ترا ہے کھویا؟
رات کی سونی سڑکوں پر پھرتا مارا مارا
مکھڑا تیرا جگمگ جگمگ من بھیتر اندھیارا
دکھ میں ڈوبا ڈوبا لاگے کیوں تیرا اجیارا
جانے کیوں لگتا ہے تُو بھی دل کی بازی ہارا
اے چاند بتا!

--

نکھری نکھری کرنیں تیری چم چم چم چم چمکیں
رات کی پلکوں سے آنسو ہولے ہولے ڈھلکیں
برہ کی ماری برہن کے نین کٹورے چھلکیں
نرمل نرمل چاندنی تیری من میں آگ لگائے
کروٹ کروٹ درد کی جھانجن جھن جھن بجتی جائے
دکھیاروں کے سنگ بھلا کیوں ساری رات ہے جاگے
بادل کی چادر میں رہ رہ منھ کیوں اپنا ڈھانپے
اے چاند بتا!
اے چاند بتا!

گیت

وہ چنچل سے دن اور بے فکر رَینا
وہ معصوم آنکھوں کا معصوم سَپنا
وہ سَکھیاں، وہ گڑیا، وہ چَوبارہ اپنا
وہ مٹی کا ننھا گھرَوندا میں ڈھونڈوں
سجن توری نگری میں کیا کیا میں ڈھونڈوں

*****

یہاں بھور متوارِی کرنیں لٹائے
یہاں شام سَندُورِی من کو لُبھائے
سَجن تُوری نگری بہت مُوہے بھائے
مگر اپنے بابُل کا اَنگنا میں ڈُھونڈُوں
سجن توری نگری میں کیا کیا میں ڈھونڈوں

ہمارا ہے سب ، کچھ نہیں تیرا میرا
ہے اک دُوجے کے دل میں اپنا بَسیرا
میں دَھرتی ہوں اور تُو ہے بادل گھنیرا
مگر ماں کے آنچل کا سایہ میں ڈھونڈوں
سجن توری نگری میں کیا کیا میں ڈھونڈوں

*****

ترا پیار جیسے ہو بادِ بہاری
مہک اٹھی جیون کی ہر اک کیاری
سجن تُوری بگیا کی ہر رُت ہے نیاری
مگر اپنا بچپن سُہانا میں ڈھونڈوں
سجن توری نگری میں کیا کیا میں ڈھونڈوں

*****

یہ مہندی کی خوشبو یہ چوڑی کی گھن گھن
پُکارے ہے تُجھ کو یہ پایل کی چھَن چھن
ترے نام کے گیت گائے ہے دھڑکن
مگر اپنے بابل کو ہر جا میں ڈھونڈوں
سجن توری نگری میں کیا کیا میں ڈھونڈوں

*****

نہ صرف دوہوں کا سا سادہ لباس پہنے ہوئے
یہ نظمیں فقیروں کی طرح اپنا راگ الاپتی پھرتی
ہیں بلکہ گلیوں محلوں میں رہنے والے لوگوں کے
لیے جو پیغام نشر کرتی ہیں، وہ بھی سادہ اور
بے لاگ ہے۔ کہیں کھوٹ نہیں ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند
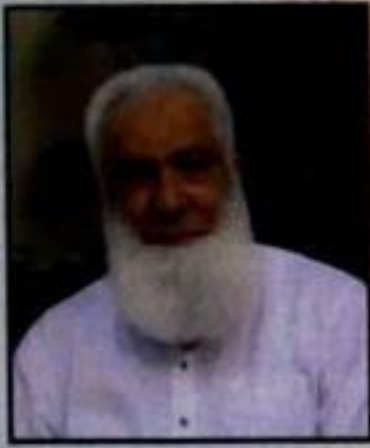
تجسم اعظمی اپنی فکر و تخیل کے بوتے پر معاشرے
کو اس کا مکروہ چہرہ دکھانے میں کوشاں اور
کامیاب ہیں۔

عزیز الدین خضری

تجسم اکیسویں صدی کی ہندوستانی شاعرہ ہیں۔
اُن کے کلام میں آج کا ہندوستان، آج کی گنگا
جمنی اردو، آج کے تقاضے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر سبودھ لعل ساقی

میری نظر میں تجسم اعظمی کی نظمیں لوسی گرے
کے معصوم قدموں کے وہی ننھے نقوش ہیں
جو برفانی طوفان کے بعد پگڈنڈی کے پل
کی سطح پر ابھر آئے ہیں۔

اخلاق بندوی

www.sandpiperpublishers.in
+91 9044343434